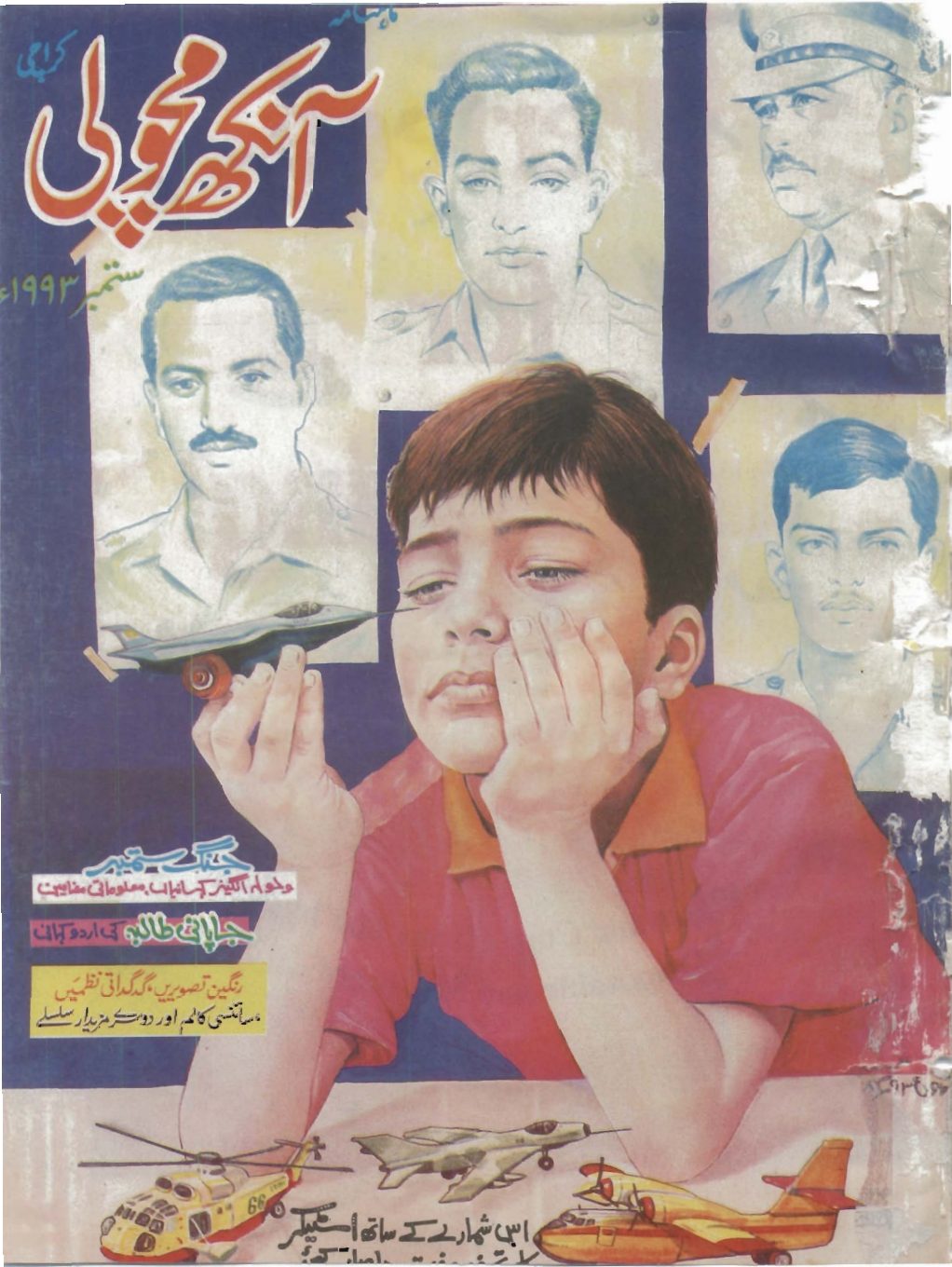

ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
ستمبر ۱۹۹۳ء
جنگ ستمبر
ولولہ انگیز کہانیاں، معلوماتی مضامین
جاپانی طالبہ کی اردو کہانی
رنگین تصویریں، گدگداتی نظمیں
سائنسی کالم اور دوسرے مزیدار سلسلے
اس شمارے کے ساتھ اسٹیکر

Perfect for any setting!

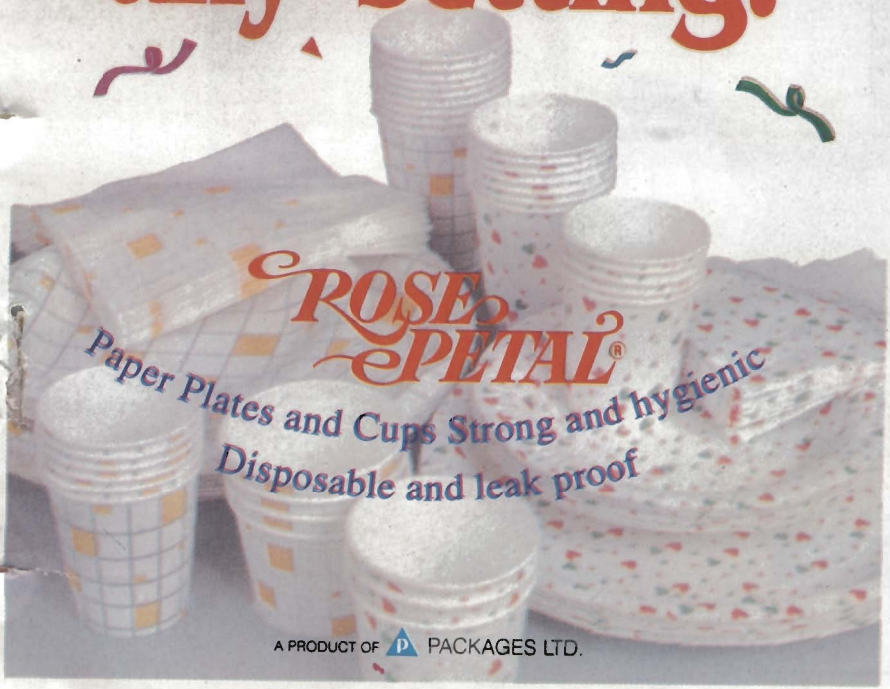

گہری اور شاندار چمک کے لیے

ریکٹ اینڈ کولمین آف پاکستان لمیٹڈ

جب آپ نیلے آسمان پہ محوِ سفر ہوتے ہیں
تو آنکھ مچولی آپ کا ہم سفر ہوتا ہے

جی ہاں!

اگر آپ کبھی پی آئی اے سے سفر کر رہے ہوں
اور آپ کا دل کچھ پڑھنے کو چاہے ـــــ تو آپ اپنے فضائی میزبان
سے آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ طلب کر سکتے ہیں

بات صرف اتنی سی ہے

آپ جہاں ہیں **آنکھ مچولی وہاں ہے**

• دلچسپ کہانیاں • مزیدار نظمیں • معلوماتی مضامین • چونکا دینے والی تصویریں

اور وہ سب کچھ جو صرف آنکھ مچولی میں ہوتا ہے

وقت کا بہترین استعمال آنکھ مچولی کا مطالعہ

آنکھ مچولی کو آپ ہمیشہ ایک سچا اور وفادار دوست پائیں گے

ادارہ آنکھ مچولی 1-پی آئی بی کالونی، کراچی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد نمبر ۸

شمارہ نمبر ۳

ربیع الاول/ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ ستمبر ۱۹۹۳ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ

تجمل حسین چشتی

منیجنگ ایڈیٹر

ایم اے فاروقی

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

نمائندہ امریکہ

عبدالرشید خان

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۔پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۱۱۵۸۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

قیمت ۱۰ روپے

۷ درہم ۷ ریال

خوش خبری ہے اک خبر

نھے مُنے ساتھیوں کے لیے خوش خبری

اب ادارہ آنکھ مچولی کے تحت تیسری سے چھٹی جماعت کے بچّوں کے لیے؛

تتلی کراچی

سلسلہ وار

جلد شائع ہو رہا ہے

قاعدہ سائز کے ۱۶ خوبصورت رنگین صفحات پر مشتمل یہ کتابی سلسلہ آپ کے لیے

- مزیدار کہانیوں
- دلچسپ مضامین
- چٹ پٹے لطیفوں اور کارٹون
- بھُول بھلّیوں
- انعامی مقابلوں اور رنگارنگ تصویروں کے ساتھ شائع ہوگا؛

یاد رہے کہ "تتلی" کا ہر شمارہ خاص موضوع پر مشتمل ہوگا

آئندہ تین شماروں کے موضوعات یہ ہیں

بلّی | پھُول | سردی

لکھنے والوں کو دعوتِ عام ہے کہ ان موضوعات پر ننھے مُنے ساتھیوں کے لیے آسان زبان میں ہلکی پھلکی مگر انتہائی مختصر تحریریں اور گنگناتی نظمیں جلد ارسال کریں

رابطہ: ا- پی آئی بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۰

حسنِ ترتیب

تاریخ کے دریچے سے ——— ادارہ — ۸

ماہ رواں کی پہلی بات ——— اداریہ — ۹

مَیں مجرم ہوں ——— محمد جاوید خالد — ۱۰

جنگ ستمبر، فتح یا شکست ——— علی فرہاد حمید — ۱۵

لڑاکا پائلٹ ——— محمد عمر احمد خان — ۲۰

بے چین لڑکا (نظم) ——— محمد جاوید خالد — ۲۴

فطرت کی آغوش میں ——— ایم مسعود ذکی — ۲۶

گندے گھر میں اچھے بھائی ——— سیما صدیقی — ۳۰

ایڈز، انسانوں کا قاتل ——— علی جبران — ۳۵

جھٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا ——— محمد عظیم قریشی — ۳۸

میرے کشمیر، تم تیرے لیے ہیں (نظم) ——— محمد نوید مرزا — ۴۳

دستانے خریدنے کے لیے ——— جونکو واتاسے — ۴۴

جب قوم یتیم ہو گئی ——— نثار احمد ہاشمی — ۴۹

درِ حیرت ——— ایاز محمود — ۵۲

ہو خالی محبت سے جو آدمی ——— قرۃ العین طاہر — ۵۶

گلگلے ——— ۵۸ — لطائف

(نظم) اُردو زبان ——— ۶۲ — خورشید انور

تایا کے طمانچے ——— ۶۳ — سلمان محسن

چیزیں گرنے کا قانون ——— ۶۶ — نگہت آراچوہان

قلم کا سفر ——— ۶۷ — نیاز احمد مدنی

مرغیاں ——— ۷۵ — منور سلطانہ فاروقی

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا ——— ۷۶ — ادارہ

حق ——— ۸۰ — ابن آس

(نظم) شیخ چلی نے مسئلہ حل کر دیا ——— ۸۶ — عبدالقادر

بخدمت جناب ——— ۸۷ — خطوں کے جواب

کیسی رہی ——— ۹۱ — رضوانہ سید علی

(نظم) تو پاک وطن ہے ——— ۹۸ — فضل ربی راہی

فوجی اصطلاحات ——— ۹۹ — جہاں زیب صدیقی

تحفہ ——— ۱۰۳ — عثمان بن سلیم

بچاؤ ——— ۱۰۸ — اشتیاق احمد

قلم قبیلے ——— ننھی تحریریں — ۱۱۵

تاریخ کے دریچے سے

بنگال کا نواب علی وردی خانؒ مرنے لگا تو اس نے اپنے پوتے سراج الدولہؒ کو وصیت کی "انگریز فرنگیوں سے خبردار رہو اور انہیں بنگال سے نکال دو۔" سراج الدولہؒ نے تخت پر بیٹھنے کے بعد انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگ میں اس کے اپنے سپہ سالار میر جعفر نے غدّاری کی اور سراج الدولہؒ کو شکست ہو گئی۔ ہارا ہوا نواب ایک اونٹ پر سوار ہو کر راج محل روانہ ہوا۔ سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تک اس کے خُسر نے بھی اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسے نازک لمحے میں صرف نواب کی بیگم لطف النّسا تھی جو سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی اور اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ پھر غدّاروں نے نواب کو شہید کر دیا اور لطف النّسا کو ڈھاکہ جلاوطن کر دیا۔ وہاں اسے ہر طرح کا آرام میسّر ہو سکتا تھا لیکن اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ شہر کے ایک دولت مند آدمی نے اسے شادی کا پیغام بھیجا تو بہادر بیوہ نے حقارت سے جواب دیا کہ جو عورت ایک شیر کی بیوی رہ چکی ہے وہ ایک چوہے کے ساتھ کیسے زندگی گزار سکتی ہے؟ لطف النسا کی ایک ہی درخواست تھی کہ اسے اس کے شوہر کی قبر کے پاس رہنے دیا جائے۔ آخر اس کی درخواست منظور ہوئی اور خوشی باغ اس کی تحویل میں دے دیا گیا جہاں اس کے شوہر کی قبر تھی۔

لوگ اکثر دیکھتے تھے کہ ایک کمزور سی عورت سیاہ لباس پہنے ہر روز خوشی باغ کے قبرستان میں جاتی تھی اور صبح کے وقت اپنے ہاتھوں سے قبر پر جھاڑو وغیرہ دیتی تھی اور باغ سے پھول لا کر قبر پر چڑھاتی تھی۔ شام کو وہ دوبارہ آتی تھی اور خوشبودار بتیاں قبر پر روشن کرتی تھی۔ وہ شوہر کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی اور سیدھی کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

سراج الدولہ شہیدؒ کو اس کے دادا نواب علی وردی خانؒ کے پہلو میں دفن کیا گیا تھا۔ آج جب کہ اس واقعے کو کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ تاریخ میر جعفر اور اس کے ساتھیوں کی غدّاری پر لعنت بھیجتی ہے اور اس کمزور عورت کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے جو اپنے عظیم جیالے شوہر کی شہادت کے بعد بھی اس کی وفادار رہی۔

اداریہ

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء ہماری قومی تاریخ کا ناقابل فراموش دن تھا۔ اس دن پاکستانی قوم نے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت کا مقابلہ کیا تھا اور اس جنگ میں ہماری مسلح افواج نے بہادری کے ایسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے تھے کہ دشمن بھی دنگ رہ گیا تھا۔ قوموں کی زندگی میں آزمائش کے ایسے دن کبھی کبھار آتے ہیں، جو قومیں اس آزمائش پہ پوری اترتی ہیں، انہیں دنیا میں عزت وقار کے ساتھ جینے کا حق مل جاتا ہے۔ پاکستانی قوم نے اس دن خود کو ایک زندہ اور بیدار قوم ثابت کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال جب ۶ ستمبر کا دن آتا ہے تو پاکستانی قوم اس کا استقبال جوش وجذبے کے ساتھ کرتی ہے اور اس دن یہ عہد کرتی ہے کہ ملک پر اگر آئندہ بھی ایسا کوئی وقت آیا تو وہ ۶ ستمبر کی یاد کو تازہ کر دے گی۔ یہ عہد کرنا اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے دشمنوں کے ارادے اب بھی اچھے نہیں ہیں..... انہیں پاکستان کا وجود گوارا نہیں ہے، پاکستان کی ترقی اور استحکام پسند نہیں ہے۔ چنانچہ ایک سچے پاکستانی کی حیثیت سے ہمیں دشمنوں کے عزائم سے باخبر رہنا چاہئے اور ایسے عمل سے بچنا چاہئے جس سے ہمارے پیارے ملک کو نقصان اور اس کے دشمنوں کو فائدہ پہنچے۔

پاکستان غالباً دنیا کا واحد ملک ہے جس کے دشمن خود ملک کے اندر پائے جاتے ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ باہر کے دشمن کا مقابلہ کرنا جتنا آسان ہوتا ہے اندر کے دشمن کا مقابلہ کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پاکستان پر اگر کوئی حملہ باہر سے ہوتا ہے تو اس حملے کا نا کام بنانے کے لئے ہم لوگ سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں لیکن پاکستان کے اندر رہنے والا اگر پاکستان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو پاکستان میں صوبائی تعصب پھیلاتے ہیں یا جو زبان اور مذہب کے نام پر بھائی کو بھائی سے لڑاتے ہیں، وہ لوگ جو امن و امان کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اس ملک کی عمارتوں کو توڑتے پھوڑتے اور بسوں کو آگ لگاتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے سیاسی فائدے کے لئے نوجوانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح بھی پاکستان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ پاکستان کا سچا دوست صرف وہ ہے جو کسی حال میں پاکستان کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ پاکستان کا دفاع..... ہر قیمت پر۔ یہی ۶ ستمبر کا پیغام ہے۔ پاکستان کو آج سچے دوستوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے عمل سے ثابت کر دینا چاہئے کہ پاکستان ہم سے ہے اور ہم پاکستان سے ہیں۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

میں مجرم ہوں

محمد جاوید خالد

بڑا عجیب نام تھا اس شخص کا۔ کم از کم میں نے پہلی بار سنا تھا اس لئے سنتے ہی اچھل پڑا۔ "کیا کہا؟ کیا نام ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ناگپال۔" یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ناگ پال۔" میں نے آہستہ آہستہ دہرایا۔ یوسف ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

وہ ایک تعلیمی ادارہ تھا۔ یوسف سے تو میری جاتے ہی دوستی ہوگئی تھی۔ جو موجود تھے ان سے دعا سلام کے بعد غیر حاضر اسٹاف سے یوسف میرا غائبانہ تعارف کروا رہا تھا۔ "یہ کیسا نام ہے یار؟" میں ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"ناگپال صاحب مسلمان نہیں ہیں، وہ کچھ سکھ ہیں اور کچھ ہندو بلکہ وہ تھوڑا تھوڑا سبھی کچھ ہیں۔ بے پناہ مطالعہ ہے ان کا خود اسلام کے بارے میں بھی بہت معلومات رکھتے ہیں۔ ہر مذہب سے رواداری کا اظہار کرتے ہیں، بتوں کی پوجا کرتے تو نظر نہیں آتے مگر گائے کا گوشت بھی نہیں کھاتے۔" یوسف نے ناگپال صاحب کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ میرے دل میں ان سے خود ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا مگر سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے بارے میں ابھی تک مشکوک تھا۔ مشرقی پاکستان (مرحوم) کا زخم کوئی بھی پاکستانی نہیں بھول سکتا اور اس سانحہ کا آغاز، میری معلومات کے مطابق، بنگال میں ہندو اساتذہ ہی نے نفرت اور تعصب کے بیج بو کر کیا تھا یہی مہم اندرون سندھ کے علاقوں میں بھی سنا تھا کہ زور و شور سے چل رہی ہے۔ ناگپال صاحب علاقائی طور پر سندھی بھی تھے۔ چنانچہ میرے ذہن میں شک کے جراثیم کا رینگنا ایک فطری بات تھی۔

"مجھے ان کے بارے میں کچھ اور بتاؤ یوسف۔" میں نے کہا۔ اب میرے لہجے میں کچھ کچھ تشویش کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔

"وہ چھٹیوں پہ ہیں، آٹھ دس دن میں واپس آجائیں گے تو خود مل لینا۔ میں تو جتنا سمجھتا تھا میں نے بتادیا۔" یوسف نے یہ کہا تو میں نے

بھی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ البتہ ناگپال صاحب کے بارے میں ایک تجسس کا احساس ضرور باقی رہا اور میں اس سلسلے میں مزید معلومات کی کرید کرتا رہا۔ ایک روز ناگپال صاحب ہی کے بارے میں ایک حیران کن بات میرے سامنے آئی یا یوں کہئے کہ ان کے بارے میں الجھے سلجھے تصورات رکھنے کی وجہ سے مجھے شدید حیرت ہوئی۔ واقعہ یوں تھا کہ ادارے کو حکومت کی طرف سے کچھ اضافی فنڈ ملے تھے۔ یہ اضافی فنڈ کچھ طلبا کی تعلیم سے متعلق تھے جن کے لئے حکومت نے کہا تھا کہ اسٹاف اپنے معمول کے وقت کے بعد انھیں پڑھائے۔ اسٹاف ہی میں سے کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ اضافی طلبا کو معمول کے اوقات ہی میں پڑھایا جا سکتا ہے اور واقعتاً ایسا ممکن بھی تھا چنانچہ ادارے کے سربراہ نے اسٹاف کو بلوا کر اس کی تائید حاصل کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اضافی فنڈ کا کیا کیا جائے؟ اسے واپس کر دیا جائے کیونکہ کام تو مقررہ اوقات ہی میں ہو رہا تھا یا پھر اس فنڈ کو اسٹاف میں تقسیم کر دیا جائے۔ کچھ لوگ اس کی تقسیم میں دلچسپی لے رہے تھے لیکن ایک شخص کھڑا ہو کر سب سے پہلے، بلند آواز سے، پرزور لہجے میں صاف صاف بولا "میں اس رقم سے اس طرح کچھ نہیں لوں گا سر، کیوں کہ یہ ناجائز ہے۔" اور یہ شخص ناگپال صاحب تھے۔

ایک غیر مسلم آئینِ مسلمانی کی آواز سب سے پہلے بلند کر سکتا ہے یہ میرے لئے انوکھا تجربہ تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ تھا لیکن اب ذہن میں اسی مشکوک آدمی کے لئے احترام کے جذبات بھی پیدا ہو رہے تھے اور آخر کار ناگپال صاحب کی چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ آگئے اور پھر ایک دن میری ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ انھوں نے مجھے بہت حیران کیا۔ نرم لہجہ، شفیق چہرہ، لبوں پر ہر وقت مسکراہٹ، علمی وقار، حاضر جوابی اور سب سے بڑھ کر ان کی خوش اخلاقی جو عاجزی اور انکساری کی حدوں تک جا پہنچتی تھی۔ ان سب چیزوں نے پہلی ملاقات کو آخری نہ بننے دیا۔ ایک کے بعد ایک ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ہر ملاقات ایک اور ملاقات پر مجھے چپکے ہی چپکے اکساتی رہی۔

ناگپال صاحب وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ ملکی زبانوں میں اردو، سندھی، پنجابی پر انھیں عبور حاصل تھا اور غیر ملکی میں انگریزی تو عام سی بات تھی اس کے علاوہ جانے انھیں کس کس زبان کے شعر حکایتیں، مقولے یاد تھے اور گفتگو میں وہ بڑی خوبصورتی سے انھیں استعمال بھی کرتے تھے۔ "آپ نے یہ سب کیسے سیکھا؟" ایک دن میں نے سوال کر ہی ڈالا۔ "میری عاجزی نے مجھے یہ سب سِکھایا"۔ ان کا جواب تھا "انسان بحیثیت انسان سب برابر ہیں۔ بابا گرونانک میرا عقیدہ ہے۔ شاہ لطیف ایک عظیم شاعر تھے۔ بابا بلھے شاہؒ کا تصوف میری جان ہے۔ فیضؔ مجھے پسند ہے غالبؔ کا میں مدّاح ہوں

اور اقبال کی شاعری مجھے بہت متاثر کرتی ہے۔ میں سب سے فیض حاصل کرتا ہوں۔ انسانیت پر میرا ایمان ہے اور عاجزی میری زندگی۔ جس دن میری عاجزی ختم ہوگئی میں مرجاؤں گا۔" ناگپال صاحب سندھی لہجے میں رواں اردو میں بول رہے تھے اور میں حیرت سے منہ کھولے انھیں دیکھ رہا تھا۔

میں اللہ تعالیٰ سے اپنی دعاؤں میں تعصب سے محفوظ رہنے کی دعا بھی کیا کرتا ہوں مگر جب انھوں نے گرونانک کا نام لیا تو دل میں چپکے سے خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بھی لیں۔

"آپ حیران ہورہے ہیں؟" وہ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر بولے۔ "آپ کے نبیؐ نے ہی تو یہ تعلیم دی ہے۔ اپنے آخری خطبے میں انھوں نے کہا تھا کہ سب برابر ہیں اور سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔" میرے ذہن میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ گونجنے لگے جو انھوں نے خطبہ حجۃ الوادع میں ارشاد فرمائے تھے: (کلھم بنی آدم و آدم من تراب) تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ کتنا بلیغ کلام ہے۔ ایک ہی جملے میں برابری اور انکساری کے اعلیٰ سبق سکھا دیئے گئے ہیں۔ میں نے سر ہلایا۔ ناگپال صاحب بولے۔ "اب ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے ماننے والے، ان کی محبت کے دعویدار بھی ایسا نہیں کرتے۔ یہ بات..... یہ بات تو بس وہیؐ کہہ سکتے تھے۔ اپنے ماننے والوں کے ساتھ ہی بیٹھنا، اٹھنا چلنا، پھرنا، مزدوری کرنا، کھانا پینا، لڑنا، صلح کرنا اور پھر معاف کر دینا، اس کو بھی جس کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہے کہ یہ جان کا دشمن تھا۔ یہ کام وہیؐ کرسکتے تھے اور ایسی بات وہیؐ کہہ سکتے تھے۔"

سیرت پاکؐ پر بڑے بڑے علما کی تقریریں میں نے سنی ہیں، متاثر بھی ہوا تھا مگر اثر کا ایک شدید قسم کا جذبہ ایک غیر مسلم کی زبان سے اپنے نبیؐ کی باتیں سن کر مجھ پر ہوا کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ "کاش!" میں نے جی میں کہا۔ "انؐ کے مبارک وقت میں میں بھی ہوتا اور اپنی گناہ گار آنکھوں کو اعتبار بخشتا۔ مجھے علامہ اقبال کا شعر بے ساختہ یاد آگیا

خوشا وہ وقت مدینہ مقام تھا اس کا
خوشا وہ وقت کہ دیدار عام تھا اس کا

"آپؐ نے سیرت کا مطالعہ بھی کیا ہے ناگپال صاحب؟" میری تسکین تو ہوئی تھی مگر میں نے حیرت سے پوچھا۔ ناگپال صاحب نے مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارا تو نہیں
صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارا تو نہیں

"واہ۔" میرے ہونٹوں سے نکلا۔ شعر نہ صرف یہ کہ حسبِ حال تھا بلکہ تھا بھی ایک غیر مسلم سکھ کا۔ جی میں پھر ایک خواہش پیدا ہوئی۔ "کیسا اچھا ہو اگر اتنا اچھا آدمی مسلمان ہو

جائے۔" اس سے پہلے کہ میں اپنی خواہش کو لبوں تک لاتا وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صرف آپ ہی لوگوں کے تو نہیں ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے بے ساختہ کہا "وہ ساری انسانیت کے محسن ہیں۔"

"جی ہاں وہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے بھی ہیں، ان کی سیرت ہمارے لئے بھی مشعل ہے اور ان کی باتیں ہماری بھی رہنما ہیں۔ بلکہ ....." وہ تھوڑی دیر رکے پھر میری طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ "بلکہ وہ آپ سے زیادہ ہمارے ہیں۔" میں سوالیہ انداز میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولے۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ سے زیادہ وہ ہمارے ہیں۔ آپ تو ان کا نام لے لے کر لڑتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کے فرمان میں بھی اپنے مطلب کی باتیں لے کر دوسروں کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور جو بات اپنے مطلب کی نہیں ہوتی اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ کا تو یہ حال ہے کہ اگر آج نبی آپ کے سامنے خود آکر آپ کو دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ اُن کی اُمت ہے۔ وہ تو صاف انکار کر دیں۔ اس لئے کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے آپ تو اس کے بالکل خلاف کرتے ہیں۔"

مجھے شدید ندامت ہوئی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے میری خواہش تھی کہ میں اپنے نبی کی تعریف ایک غیر مسلم سے سنوں اور اب میرا یہ حال تھا کہ وہی غیر مسلم مجھے آئینہ دکھا رہا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ جس طرح غیر مسلم سے نبی کی تعریف سننا مجھے اچھا لگ رہا تھا اسی طرح اس کے آئینہ دکھانے نے مجھے اپنے وجود کی ساری گندگی دکھا دی۔ اگرچہ اسی طرح کی باتیں میں کئی بار اپنے علما سے بھی سن چکا تھا۔ میں سوچنے لگا یہ غیر مسلم کتنا سچ کہہ رہا ہے کہ اپنے نبی کی باتیں، ان کے حکم ہم صرف چھوڑتے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے بالکل خلاف کرتے ہیں۔ "اوہ خدایا! یہ تو دہرا جرم ہے۔" میں بڑبڑایا ایک تو عمل نہ کرنا دوسرا اس کے بالکل الٹ کرنا۔ میرا سر جھک گیا۔ ندامت نے میری گویائی چھین لی۔ میں اپنی ذات کے بارے میں اپنے اعمال کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے قیامت آگئی ہے۔ حشر برپا ہو گیا ہے۔ اپنا اپنا اعمال نامہ لے کہ ہر شخص حساب کتاب کے اذیت ناک مرحلے سے گزر رہا ہے۔ کسی کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے۔ مگر نبی کا دامن، میرے نبی کی شفاعت، میری امید بندھتی ہے۔ میں دیوانہ وار پناہ کی تلاش میں اپنے نبی کی جانب لپکتا ہوں۔ میں ان کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ میں ان کے سامنے تھا۔ ان کی نظریں مجھ پر تھیں مگر وہ نظریں..... مجھ میں نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔ مجھ سے کھڑا بھی نہ رہا گیا اور میں ان کے قدموں پر گر گیا۔ "میں مجرم ہوں۔" میں دل سے

کرایا۔ "یارسول اللہ ؐ میں آپ کا مجرم ہوں، آپ کا نام لیتا رہا اور آپ کے حکم توڑتا رہا بلکہ اس کے الٹ کرتا رہا۔ میں مجرم ہوں۔" میرا گلا رندھ گیا۔ "آپ ؐ ..... آپ نے کہا، "میں اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔" میری بد اخلاقی لوگوں کے دل توڑتی رہی۔ آپ ؐ نے کہا "مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔" میں ..... میری زبان شعلے اگلتی رہی اور میرے ہاتھ اس آگ کو اور بھڑکاتے رہے۔

آپ ؐ نے کہا "مسلمان کا خون مسلمان پر حرام ہے۔" میں بے دریغ مسلمانوں کا خون بہاتا رہا آپ ؐ نے کہا "کافر ہے وہ جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور پڑوسی بھوکا سوئے۔" میں نے کبھی پڑوسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ گندگی پھیلائی۔ شور مچا کر ان کو تنگ ہی کرتا رہا۔

آپ ؐ نے کہا "اپنے مسلمان بھائی کے لئے مسکرا دینا بھی صدقہ ہے۔" میں اسے ذلیل کرنے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ آپ ؐ نے لقمۂ حلال کھانے کا حکم دیا۔ میں حرام سے پیٹ کا جہنم بھرتا رہا۔ آپ ؐ نے سچ کی ترغیب دی میں جھوٹ کی عمارتیں کھڑی کرتا رہا۔

آپ ؐ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا اور میں مؤذن کی صدا سنی ان سنی کرتا رہا۔ آپ ؐ نے عزت کا معیار "نیکی" کو بتلایا اور میں دولت کی ہوس میں دولت والوں کے ناز اٹھاتا رہا

..... "میں مجرم ہوں ..... میں آپ کا مجرم ہوں یارسول اللہ ؐ" سوچوں کے ڈنک تھے جو مسلسل میرے وجود میں چبھ رہے تھے۔ میرا بس نہ چلتا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں۔ کچھ دیر بڑی ہولناک سی خاموشی چھائی رہی۔ میں نے آہستہ آہستہ سر کو ذرا سا اٹھایا۔ ناگپال صاحب میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا "ناگپال صاحب کچھ دیر پہلے میرے جی میں آیا تھا کہ میں آپ کو دعوت دوں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے متاثر ہیں، ان کی تعلیمات کی قدر کرتے ہیں تو آپ مسلمان ہو جائیں مگر اب ..... اب میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتا۔" "آپ کہیں۔" وہ فوراً بولے۔ "آپ کہیں، مجھ سے اور لوگوں نے بھی کہا ہے۔ میں تیار ہوں۔ میں کہتا ہوں آپ مجھے مسلمان کریں۔" میں نے چونک کر تیزی سے سر اٹھایا۔ میری دھندلی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔

"آپ مجھے مسلمان کریں مگر میرا ایک سوال ہے۔" وہ بولے۔ "سوال یہ ہے کہ آپ مجھے کون سا مسلمان بنائیں گے۔ شیعہ مسلمان، سُنّی مسلمان، دیوبندی مسلمان، بریلوی مسلمان یا وہابی مسلمان۔

ناگپال صاحب کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور میرا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

جنگ ستمبر
فتح یا شکست

علی فرہاد حمید

۵ اور ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی درمیانی رات کبھی بھلائی نہیں جا سکے گی۔ اس رات بھارت نے پاکستان کی سرحدوں پر نہایت بزدلانہ حملہ کیا تھا۔ پاکستان کی مسلح افواج نے اس حملے کا نہایت بہادری سے مقابلہ کیا اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ بھارت نے یہ حملہ لاہور پر کیا تھا۔

اگلے دن جب پاکستانی عوام کو اس کی اطلاع ملی تو پورے ملک میں زبردست جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ بھارت حالانکہ اپنی آبادی، رقبے اور فوجی ساز و سامان کے اعتبار سے پاکستان سے پانچ گُنا بڑی طاقت تھا لیکن پاکستانی عوام میں کوئی خوف و ہراس نہیں پایا جاتا تھا۔ ریڈیو پاکستان نے جنگی نغمے نشر کر کے پوری قوم کو جہاد کے جذبے سے سرشار کر دیا۔ جب بھارت کے جنگی طیارے بم برسانے کے لئے آتے تو بچے بوڑھے اور جوان اپنی چھتوں پہ چڑھ جاتے اور ان طیاروں کو مکے دکھانے لگتے

تھے۔ پوری قوم میں ایسی یکجہتی اور اتحاد قائم ہو گیا تھا کہ ایسا نظارہ پھر اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ جنگ سترہ دن جاری رہی اور ان سترہ دنوں میں ملک میں جرم، لاقانونیت، اغوا، قتل، چوری اور ڈکیتی کا ایک واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔

اقوام متحدہ بلکہ امریکہ کی مداخلت سے دونوں ملکوں میں جنگ بندی ہوئی۔ روس کے شہر تاشقند میں معاہدہ ہوا جس کے تحت دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے مقبوضہ علاقوں سے اپنی اپنی فوجیں واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔

اس جنگ کو آج ۲۸ سال ہو گئے ہیں اور اس جنگ کے بارے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس جنگ میں پاکستان کو فتح ہوئی تھی یا شکست۔ اس وقت کی جنرل ایوب خان کی حکومت نے جنگ کو پاکستان کی فتح کے طور پر پیش کیا تھا اور اس وقت کے حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔

مگر پاک فوج کے کئی اہم اور سینئر افسروں اور خصوصاً سابق چیف آف دی آرمی اسٹاف ریٹائرڈ جنرل مرزا اسلم بیگ کا یہ اعتراف کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ مکمل فتح نہیں تھی، ہمیں یہ جائزہ لینے پر مجبور کرتا ہے کہ اس جنگ میں پاکستان نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ آیئے واقعات کی روشنی میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے تین پہلوؤں میں پہلا پہلو یہ ہے کہ اس جنگ میں مسلح افواج اور عوام نے پہلی مرتبہ متحد ہو کر ملک کا دفاع کیا۔ عوام نے اپنی فوج سے والہانہ محبت کا ثبوت دیا۔ یہ اس جنگ کا سب سے اہم، حقیقی اور قابل قدر پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ بھارت نے پاکستان پر اچانک حملہ کیا تھا۔ دشمن ناگہانی حملہ اس لئے کرتا ہے کہ دوسرے فریق کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے لیکن پاکستانی فوج کی یونٹوں اور جوانوں نے اپنی لازوال بہادری اور شجاعت سے اس ناگہانی حملے کو ناکام بنا کر جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں کی مثال ہی لے لیں جہاں بھارتی فوج نے اچانک حملے کی وجہ سے ناقابل یقین برتری حاصل کر لی تھی۔ لاہور میں بھارتی فوج نے تمام ابتدائی دفاعی رکاوٹیں بغیر مزاحمت کے عبور کر لیں اور بی آر بی نہر کے کنارے پہنچ گئی حالانکہ پاکستانی دستے مکمل تیاری کی حالت میں نہ تھے مگر اس کے باوجود نہ صرف انہوں نے بھارتی فوج کو روک لیا بلکہ ان کی یلغار موڑنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

سیالکوٹ میں بھی پاکستانی فوج نے بھارتی بکتر بند دستوں کو ناقابل تلافی نقصان پایا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ جونیئر کمانڈروں اور جوانوں کی بہادری کی وجہ سے یہ جنگ پاکستان نے جیت لی تھی۔ گویا جونیئر کمانڈروں نے فوری طور پر نہایت عمدہ تدبیریں اختیار کیں جس کی وجہ سے انہوں نے نہ صرف اپنی اعلیٰ کمان کی غلطیوں کا ازالہ کیا بلکہ پاکستان کو دشمن کے ہاتھوں سے بچا بھی لیا۔

اب جنگ ستمبر کے تیسرے پہلو کی طرف آیئے۔ تیسرے پہلو کا تعلق جنگی منصوبہ بندی،

جنگی چالوں اور فوج کی تیاری اور تنظیم وغیرہ سے ہے جو اعلیٰ کمانڈر اور جنرل اسٹاف جنگ سے پہلے، اور جنگ کے دوران، جنگ لڑنے اور جیتنے کے لئے کرتے ہیں۔ اس پہلو سے ہمیں بہت سی خامیاں اور غلطیاں نظر آتی ہیں۔ سیالکوٹ کے محاذ پر جوانوں اور جونیئر کمانڈروں نے اعلیٰ کمان کی غلطیوں کا جس طرح اپنی جانوں پر کھیل کر ازالہ کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ سیالکوٹ میں چونکہ ایک کور کمانڈر موجود تھا اس لئے اس نے صورتحال کو ابتر ہونے سے بچا لیا۔ جنرل رانا نے جنرل ہیڈ کوارٹر (جی ایچ کیو) سے ملنے والے پس قدمی (پیچھے ہٹنے) کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور اگلی صفوں میں لڑنے کا انتہائی جرأت مندانہ اقدام کیا اور ہمارے جوانوں نے ان کے فیصلے کی لاج رکھ لی۔ اور دشمن کو بُری طرح ناکامی ہوئی۔ کھیم کرن کے محاذ پر پاکستانی فوج نے مشکل ترین جنگی حالات میں مثالی کامیابی حاصل کی لیکن آسان ترین اقدام میں بدترین ناکامی۔ اس محاذ پر پاکستان آرمی کے دو ڈویژن، ایک انفنٹری اور ایک بکتر بند اس خاموشی سے جمع ہوئے کہ دشمن کو بھنک بھی نہ پڑ سکی۔ اس وقت پاکستانی فوج کی تعداد اتنی کم تھی کہ اس قدر قوت کا ایک جگہ اکٹھا ہونا ایک قابل فخر کارنامہ تھا۔ منصوبے کے مطابق انفنٹری ڈویژن نے کھیم کرن پر قبضہ کر کے برج ہیڈ بنانے کا کام کامیابی سے سرانجام دیا۔ (برج ہیڈ = دشمن کی صفوں، آبی رکاوٹوں اور شہری علاقوں کو عبور کر کے اپنی فوج کو محفوظ راستہ فراہم کرنا) اب پوزیشن یہ تھی کہ دشمن کی صفوں اور مورچہ بندیوں میں شگاف پڑ چکا تھا اور پاکستان کا بکتر بند ڈویژن اس برج ہیڈ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے سامنے دریائے ستلج اور بیاس تک سارا علاقہ..... بلکہ دہلی تک سارا علاقہ خالی پڑا تھا اور مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بکتر بند ڈویژن اگر یہاں سے آگے بڑھتا تو لاہور کے محاذ پر موجود ساری بھارتی فوج بھی پاکستانی فوج کے نرغے میں آجاتی۔ بھارتی ہائی کمان تو بیاس پر دوسری دفاعی لائن بنانے کے احکامات بھی دے چکی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ پاکستانی عسکری تاریخ کا المیہ ہی یہ ہے کہ پھر کچھ بھی نہ ہوا۔ بکتر بند ڈویژن اپنی منزل کی طرف گامزن ہی نہ ہوا اور کسی مزاحمت کی نہ ہونے کے باوجود کھیم کرن کے نواح میں ہی بکھر گیا۔ ایسا سنہری موقع جو شاید پھر کبھی نہ ملے اعلیٰ کمان کی نا اہلی کی وجہ سے ہاتھ سے نکل گیا۔ کیوں؟ اس کا جواب آج تک ہمیں نہیں ملا، اگرچہ ہمارے گرد

○ ..... ایک صاحب خودکشی کے بے حد خلاف تھے۔ موقع بے موقع وہ خودکشی پر لیکچر شروع کر دیتے ایک دفعہ وہ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ اتفاق سے موضوع بھی خودکشی ہی تھا۔ وہ تقریر کرتے ہوئے بہت زیادہ جذباتی ہو گئے اور جذبات میں آکر کہنے لگے.....

"خودکشی کفر ہے، گناہ ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ انسان زہر کھا کر مر جائے۔"

(ارم مبین آرائیں/ مسرور کالونی، کراچی)

اس قومی جرم کے بہت سے کردار موجود ہیں۔ گویا ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہماری فوجی کمان سے ناقابل معافی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ دانستہ بھی اور نادانستہ بھی۔ شاید ان غلطیوں کی بنیاد ناکافی فوج، ناکافی بجٹ، ناکافی تیاریاں وغیرہ تھی۔ لیکن جنرل اسی لئے جنرل ہوتا ہے کہ وہ اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کر لے۔ اب ہم اپنے بنیادی سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا قومی اور سیاسی لحاظ سے اس جنگ کا مقصد حاصل ہوا؟

یہ جنگ دراصل مسئلہ کشمیر حل کرنے اور کشمیر کو آزادی دلانے کے لئے لڑی گئی لیکن جنگ کے اختتام پر مسئلہ کشمیر میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی اور معاہدہ تاشقند میں کشمیر کا ذکر تک نہ تھا۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی فوج اور عوام نے جس مسئلہ کو اپنا خون دے کر زندہ کیا وہ پاکستانی قیادت نے مذاکرات کی میز پر ہار دیا۔ جس کے نتیجے میں اب بھی ایک نئی جنگ کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔

گویا ۱۹۶۵ء کی جنگ ایک غیر نتیجہ جنگ تھی۔ چونکہ اس جنگ سے وہ مقصد حاصل نہ ہوا جس کے لئے یہ لڑی گئی اس لئے یہ اس نقطۂ نظر سے ناکام جنگ تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے پاکستانی قوم کو اعتماد بھروسہ، اتحاد اور اپنی پہچان کے انمول لمحات سے آشنا کیا۔ مسلح افواج اور قوم کے درمیان ایک پائیدار اعتماد اور یک جہتی کی بنیاد رکھی اور پاکستانی فوج کے جوانوں کی ہمت و جرأت کو اجاگر کیا۔ پاکستانی ہائی کمان کو اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کو پرکھنے کا موقع ملا۔ اور قوم پر یہ ثابت ہوا کہ گو جنگ تو میدانوں، پہاڑوں، ریگستانوں، فضاؤں، دریاؤں اور سمندروں وغیرہ میں لڑی جاتی ہے لیکن جنگ کا اصل فیصلہ سیاسی قیادت کے ہاتھوں مذاکرات کی میز پر ہوتا ہے۔ سیاسی جرأت بھی جنگ کا لازمی اور اہم ترین حصہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اک مسافر کو رستے میں نیند آگئی

نوجوان ادیب تنویر احمد شاہد ۱۸ جولائی ۱۹۹۳ء کو سیلاب کے پانی میں ڈوب کر جاں بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝ مرحوم کا تعلق مظفر گڑھ سے تھا۔ وہ بچوں کے اچھے ادیب اور ملنسار انسان تھے۔ ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ رفاہی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ وہ پاکستان ینگ رائٹرز فورم کے رکن، گلیکسی آف ینگ رائٹرز کے صدر اور فلاحی تنظیم "الخدمت" کے جنرل سیکریٹری تھے۔

ادارہ آنکھ مچولی تنویر احمد شاہد کی ناگہانی موت پر غم زدہ ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے۔ (آمین)

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

یہ چھوٹے چھوٹے بم دشمن کو تہس نہس کر دیں گے

سیاچن کی برف پوش چوٹی پر آگے بڑھنے کا ایک انداز

سمندر میں ہنگامی امداد

دشمن پر برق رفتاری سے حملہ

رات کی تاریکی میں دشمن کے علاقے میں پیش قدمی

لڑاکا پائلٹ

محمد عمر احمد خان

ہاف ٹائم میں جب کچھ لڑکے کاغذ کے جہاز بنا کر اُڑانے لگتے تو وہ بڑی دلچسپی سے ان نقلی جہازوں کو دیکھنے لگتا جو لڑکوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد فضا میں تیرتے ہوئے اوپر جاتے اور پھر بڑی آہستگی سے ایک گول چکر کاٹ کر زمین پر اُتر آتے۔ اسے یہ منظر بے حد پسند آتا۔ وہ بڑی دلچسپی سے جہازوں کو اڑتا دیکھنے لگا۔

لڑکے کاپی میں سے کاغذ پھاڑ پھاڑ کر ہوائی جہاز بناتے تو وہ بھی انہیں دیکھ کر اپنی کاپی میں سے کاغذ پھاڑتا اور ہوائی جہاز بناتا لیکن صرف لڑکوں کے جہاز فضا میں تیرتے ہوئے جاتے اور آہستگی سے نیچے اُتر آتے جب کہ اس کا بنایا ہوا جہاز فضا میں اوپر تو جاتا لیکن کئی قلابازیاں کھانے کے بعد نیچے گر جاتا۔ وہ کاغذ پھاڑ کر دوسرا، تیسرا پھر چوتھا ہوائی جہاز بناتا لیکن ہر بار اس کا بنایا ہوا جہاز نیچے گر پڑتا۔ نہ جانے کیوں؟ لڑکے مسکرا کر کہتے "تم کیسے پائلٹ ہو؟

تمہیں تو جہاز اُڑانا ہی نہیں آتا!!" یہ سُن کر وہ جھینپ جاتا لیکن پھر جھٹ سے کہتا۔ "یہ تو نقلی جہاز ہیں اس لئے گر گئے لیکن جب میں اصلی جہاز اڑاؤں گا تو اسے گرنے نہیں دونگا اور میرا جہاز لڑاکا ہوگا لڑاکا!!"

"لڑاکا" اس کا خطاب تھا۔ اسکول میں وہ اسی نام سے مشہور تھا۔ اس کی صحت اچھی تھی، قد لمبا تھا اور ہاتھ پاؤں مضبوط تھے۔ پھر اس کا دماغ بھی "کچھ گرم" تھا۔ پڑھنے میں اسے اتنا مزہ نہیں آتا جتنا لڑنے میں آتا لیکن وہ ہر کسی سے نہیں لڑتا، شیطان لڑکوں سے لڑتا جو اپنے سے کمزور لڑکوں کو تنگ کرتے اور ستاتے تھے۔ شیطان لڑکوں کا ٹولہ اس سے خائف رہتا تھا کیوں کہ ان میں سے اکثر کی وہ اپنے مضبوط ہاتھ پیروں سے مرمّت کر دیتا تھا۔

ماسٹر صاحب جب کلاس میں لڑکوں سے پوچھتے کہ پڑھ لکھ کر مستقبل میں وہ کیا بنیں گے تو کوئی بتاتا ڈاکٹر کوئی کہتا انجینئر۔ کوئی وکیل بننا چاہتا تو کوئی آرٹسٹ اور جب ماسٹر صاحب اس سے پوچھتے تو وہ بڑے جوش سے کہتا۔ "سر! میں پائلٹ بنوں گا لڑاکا پائلٹ اور اپنے ملک کی حفاظت کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دوں گا۔" ماسٹر صاحب اس کا عزم سے بھرا جواب سُن کے بے حد خوش ہوتے اور اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہتے۔ "تم واقعی لڑاکا ہو۔ میں تمہاری بہادری کے قصّے سنتا رہتا ہوں۔ شیطان اور بُرے لڑکے تم سے بہت ڈرتے ہیں اور مجھے یقین ہے جب تم لڑاکا پائلٹ بن جاؤ گے تو دشمن بھی تمہارے..... نام سے تھر تھر کانپے گا۔" ماسٹر صاحب کی یہ بات سُن کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں اور وہ تصوّر ہی تصوّر میں خود کو لڑاکا پائلٹ کے روپ میں جنگی جہاز اُڑاتے ہوئے دیکھنے لگتا اور پھر لڑنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے میں وہ دل لگا کر محنت کرنے لگا۔ وقت آگے بڑھتا رہا اور اس کی محنت آہستہ آہستہ رنگ لانے لگی۔ جماعتوں میں اس کے اچھے نمبر آنے لگے۔ لڑکپن کا دور ختم ہوا اور جب اس کی تعلیم مکمل ہوئی تو وہ پائلٹ بن چکا تھا، لڑاکا پائلٹ۔

نیلے آسمان پر بادلوں سے بھی اوپر وہ اپنے جنگی جہاز کو اُڑاتا اور جب فضائی کرتب دکھانے کا مظاہرہ ہوتا تو وہ اپنے لڑاکا جہاز کو بہت نیچے لے آتا اور اسے کئی قلابازیاں کھلاتا۔ لوگوں کے دل دھک سے رہ جاتے۔ یوں لگتا جیسے اس کا جہاز زمین پر گرنے والا ہو لیکن گرنے سے پہلے ہی اس کا جہاز غوطہ لگا کر اوپر فضا میں بلند ہو جاتا اور لوگ اس کی اعلیٰ مہارت پر خوشی سے تالیاں بجانے لگتے۔

دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک روز دشمن ملک نے آدھی رات کی تاریکی میں اس کے وطن پر حملہ کر دیا۔ جب حملہ ہوا تو اس کے وطن کے لوگ سوئے ہوئے تھے لیکن وطن کی بہادر فوجیں جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی بہادری سے دشمن کے حملے کو روکا اور جوابی حملہ کر دیا۔ دشمن

کی طاقت تین گنا تھی۔ اس کے پاس اسلحہ بھی بہت تھا لیکن ایمان کا جذبہ نہیں تھا۔

دشمن کے جنگی جہازوں نے لڑاکا پائلٹ کے وطن پر حملہ کیا تو وہ بہت غضبناک ہوا۔ "میں آرہا ہوں بزدل دشمنو! اب ذرا بچ کر رہنا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ دشمن کے جہاز چیل کوّوں کی طرح اس کی پاک سرزمین کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے اور وہ نیلی فضاؤں میں اپنے ساتھی پائلٹوں کے ساتھ ان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے تاب تھا پھر جیسے ہی دشمن کے جہاز قریب آئے۔ لڑاکا پائلٹ اپنے ساتھی پائلٹوں کے ساتھ کسی غضبناک شاہین کی طرح ان پر جھپٹ پڑا۔ پہلے ہی ہلّے میں اس کے لڑاکا جہاز نے دشمن کے تین جہازوں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ اس کے ساتھی پائلٹ بھی بڑی بہادری سے دشمن کے جنگی طیاروں کا صفایا کر رہے تھے۔ آسمان کی فضا بموں کے دھماکوں اور جنگی جہازوں کی خود کار مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے لرز رہی تھی۔ دشمن کے جہاز آگ اور شعلوں کا لباس پہن کر نیچے گر رہے تھے۔ لڑاکا پائلٹ کا جوش عروج پر تھا۔ وہ دشمن کے کسی ایک طیارے کی طرف لپکتا تو کبھی دوسرے کی طرف۔ اسے اپنی خود کار مشین گنوں کا نشانہ بناتا اور پھر اسے تباہ کرنے کے بعد اچانک غوطہ کھا کر کسی تیسرے طیارے پر حملہ آور ہو جاتا۔ اس کے غضبناک حملوں سے دشمن کے جہازوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ دشمن کے بچے کچھے جہاز شکست کے آثار دیکھ کر پسپائی اختیار کرنے لگے۔ انہیں میدان چھوڑ کر بھاگتا دیکھ کر لڑاکا پائلٹ اور اس کے ساتھیوں نے دشمن کا پیچھا کیا اور تین جہاز مزید گرا دیئے۔ پھر دشمن ملک کی سرحد قریب آگئی تو کنٹرول ٹاور سے وائرلیس پر ہدایت ملی کہ پیچھا کرنے والے تمام جنگی طیارے واپس آجائیں۔ اس کے ساتھی پائلٹ واپس لوٹنے لگے لیکن لڑاکا پائلٹ واپس نہیں آیا۔ وہ دشمن کے جہازوں کا پیچھا کرتا ہوا ان کے ملک کی سرحد میں داخل ہو گیا۔

"لڑاکے! واپس آجاؤ۔" کنٹرول ٹاور سے پیغام ملا لیکن لڑاکا پائلٹ نے پیغام سُن کر کہا۔ "سر! جب تک میں دشمن کا آخری جہاز نہیں گرادوں تب تک واپس نہ لوٹوں گا۔" اب وہ دشمن کے ملک کی فضاؤں میں تھا۔ اس کے سامنے دشمن کے تین جہاز بھاگ رہے تھے۔ اس نے دائیں جانب سے اپنے جہاز کو غوطہ دیا اور دشمن کے دو جہازوں کو گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔ "ہرّے!" لڑاکا پائلٹ نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ اب اس کے سامنے صرف ایک جہاز باقی رہ گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے لپکا لیکن دشمن پائلٹ نے بڑی مہارت سے اپنے طیارے کو ایک غوطہ دیا اور بائیں جانب مڑ گیا۔ لڑاکا بھی اتنی ہی تیزی کے ساتھ پلٹا۔ دشمن طیارے کا پائلٹ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگا تھا۔ اس کو اپنی جان بچانی مشکل ہو رہی تھی پھر اس کی مدد کو بہت سارے جنگی جہاز آگئے اور انہوں نے لڑاکا

پائلٹ کے جنگی جہاز کو گھیرے میں لے لیا۔ "ہتھیار ڈال دو! تم ہمارے گھیرے میں ہو۔" دشمن کے اسکواڈرن لیڈر کا پیغام ملا۔ دشمن کے جہاز اسے گھیر کر اپنے ہوائی اڈے کی طرف لے جانے لگے۔ "میں لڑاکا پائلٹ ہوں، ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔" وائرلیس پر اتنا کہہ کر اس نے اچانک دشمن کا گھیرا توڑا اور فائرنگ کرتا ہوا غچہ دے کر اپنے جہاز کو نیچے کی طرف نکال لے گیا۔ لیکن دشمن کے جہاز چیل کوؤں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے۔ تڑ تڑ تڑ ..... تڑ تڑ .....!!! جہازوں کی خود کار مشین گنیں آگ اُگلنے لگیں۔ ایک گولی اس کے جنگی جہاز کے پر میں لگی اور اس کا جہاز قلابازیاں کھاتا ہوا مزید نیچے گرنے لگا۔ اس نے کاک پٹ سے صورتحال کا جائزہ لیا پھر اپنے کنٹرول ٹاور کو پیغام بھیجا۔ "میرے لڑاکے جہاز کے پر میں گولی لگ گئی ہے۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" "اپنی جان بچاؤ اور پیراشوٹ کے ذریعے طیارے سے چھلانگ لگا دو۔" پیغام ملا لیکن لڑاکا پائلٹ اپنے گرتے ہوئے طیارے کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا جہاز سنبھل گیا اور پھر ہوا میں اُڑنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ دشمن کے ہوائی اڈے پر پڑی جہاں بہت سارے طیارے بموں سے لیس پرواز کے لئے تیار کھڑے تھے۔ "یہ ابھی اُڑیں گے اور میرے ملک پر حملہ کر کے میرے لوگوں کو نقصان پہنچائیں گے لیکن میں انہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" لڑاکا پائلٹ نے بے چینی سے سوچا۔ چشم زدن میں اس کے ذہن نے ایک فیصلہ کیا "میں واپس نہیں جاؤں گا"۔ اس نے اپنے لڑاکا جہاز کو واپس دشمن کے ہوائی اڈے کی طرف موڑ دیا۔

"سر! میں اپنا جہاز دشمن کے ہوائی اڈے پر گرا رہا ہوں۔" اس نے بڑی بے خوفی کے ساتھ اپنا آخری پیغام کنٹرول ٹاور کو بھیجا۔ دشمن کو بالکل یقین نہ تھا کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے گا لیکن اس کے لڑاکا جہاز نے کئی قلابازیاں کھائیں اور لہراتا ہوا ہوائی اڈے پر کھڑے دشمن کے بموں سے لیس بمبار جہازوں پر جا گرا۔ فضا میں یکے بعد دیگرے کئی کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہوئے۔ دشمن کے بموں سے لیس تمام جنگی جہازوں کے پرخچے اُڑ چکے تھے اور دشمن کا نہایت اہم ہوائی اڈا تباہ و برباد ہو چکا تھا۔

بچپن میں جب لڑاکا پائلٹ کے ساتھی کاغذ کے ہوائی جہاز بنا کر اُڑاتے تھے تو اس کے بنائے ہوئے جہاز ہمیشہ نیچے گر جاتے تھے۔ پھر دوست مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے۔

"تم کیسے پائلٹ ہو؟ تمہیں تو جہاز اُڑانا ہی نہیں آتا" تو وہ کہتا تھا "یہ تو نقلی جہاز ہیں اس لئے گر گئے لیکن جب میں اصلی جہاز اُڑاؤں گا تو اسے گرنے نہیں دوں گا..... اور تب.... اسے معلوم نہ تھا کہ وطن کی حفاظت کیلئے کبھی کبھی اصلی جہازوں کو بھی گرانا پڑتا ہے!!!

بے چین لڑکا

محمد جاوید خالد

وہ ننھا سا مُنا سا چھوٹا سا لڑکا
وہ جب نئی شے کوئی دیکھتا ہے
مگر ذہن اس کا بتاتا نہیں کچھ
وہ مجبور ہو کر، بڑے ہیں جو اس کے
وہ اکثر بزرگوں سے یہ پوچھتا ہے
وہ یہ سوچتا ہے تجسس کے مارے
بھلا چاند گھٹتا ہے، بڑھتا ہے کیونکر
ہے نیلا فقط رنگ کیوں آسماں کا
ہوا کو نظر کیوں نہیں دیکھ پاتی
وہ یہ سوچتا ہے کہ آندھی جو آئی

بہت کم ابھی جس نے دیکھی ہے دُنیا
تو ہو ہو کے حیراں بہت سوچتا ہے
بتاتا تو تب! اس کو آتا کہیں کچھ
سوال ان سے کرتا ہے سو سو طرح کے
یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ یہ کیسے ہوا ہے
چمکتے ہیں کیوں آسماں پر ستارے
یہ ہر شام جاتا ہے سورج کہاں پر
یہ کیوں نہ ہوا لال، پیلا، ہرا سا
کہاں سے یہ آئی، کدھر کو ہے جاتی
تو پُر شور آواز کیوں ساتھ لائی

یہ بادل ہیں کیا آسماں پر بناتے
پرندے ہواؤں میں اُڑتے ہیں کیسے
صبح چائے امّی ہیں جب بھی بناتی
ہے کیوں تیرتی لکڑی پانی کے اوپر
پگھل کر ہے کیوں برف پانی بناتی
اسے جستجو ہے کہ اک بیج چھوٹا
ہیں کیوں پھول مُرجھا گئے ایک دم ہی
ہمیں کیا ضروری ہے کھانا یا پینا
غرض اس طرح کی ہیں باتیں بہت سی
مگر ننھے بچے دُعا ہے یہ میری
تجسّس تجھے یونہی بے چین رکھے
کہ لاتی ہے ہر جستجو کامیابی
ترقی ہے، اب تک جو دنیا نے پائی

زمیں پر کبھی کیوں نہیں آتے جاتے
نہیں اُڑنے پاتا میں کیوں ان کے جیسے
جسے "بھاپ" کہتے ہیں کیوں کر ہے آتی
مگر ڈوب جاتے ہیں کیوں سوئی، پتھر
ہر اک شے کو ہے آگ کیسے جلاتی
بناتا ہے کیسے کوئی پھل بڑا سا
ہے کیوں مارتی ڈنک مکھی شہد کی
ہے ممکن نہیں کیوں بغیر اس کے جینا
کبھی تنگ آتے ہیں جن سے بڑے بھی
سلامت رہے جستجو یوں ہی تیری
مزہ کامیابی کا ہر دم تو چکھے
نہ ہو جستجو تو خرابی، خرابی
تجسّس نے ہی راہ اس کی دکھائی

(مرکزی خیال ماخوذ)

فطرت کی آغوش میں

ایم مسعود ذکی

انسان نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی، اس نے فطرت کا نہایت قریب سے اور گہرا مشاہدہ کیا۔ اپنے اردگرد پھیلی ہوئی اس رنگ برنگی دنیا سے اس نے بہت کچھ سیکھا، ننھی ننھی چڑیوں کو نیلے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی پرواز کی خواہش ہوئی اور بالآخر یہ خواہش ایک ہوائی جہاز کے روپ میں پوری ہوگئی۔ مچھلیوں کو پانی میں تیرتے دیکھ کر اس نے آبدوز اور کشتیاں بنا ڈالیں۔ چمگادڑ کے اُڑنے کے اصول پر اس نے ریڈار کو عملی شکل دے دی۔

فطرت کا یہ تمام حیرت انگیز نظام اس قدر سائنٹیفک انداز سے چل رہا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سائنس دان برسوں سے پودوں اور جانوروں کا نہایت گہرا مشاہدہ کر رہے ہیں اور اس بات کی حقیقت تک پہنچ گئے ہیں کہ قدرت کا وسیع و عریض کارخانہ نہایت متناسب انداز میں چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ان مخلوقات کو زمین کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا نہایت بہترین انداز

اختیار کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی بھی جگہ ایک قسم کی مخلوق کی غیر معمولی کثرت نہیں ہوتی۔

مخلوقات کی ہر نوع اپنے محدود علاقے میں رہنا پسند کرتی ہے جہاں اس کو ساز گار ماحول اور خوراک میسر ہوتی ہے، مثلاً آسٹریلیا کا کنگرو، نیوزی لینڈ کا کیوی یا چین کا پانڈا۔ یہی حال پودوں کا بھی ہے۔ اس کے برعکس یعنی مخلوقات کی نوع دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہیں مثلاً گھریلو مکھی جو بہت وسیع علاقے میں پائی جاتی ہے۔

موسمی حالات کی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر، بیماریوں کے پھیل جانے، یا کسی قدرتی آفات کا شکار ہو کر جانور ایک مقام سے دوسرے مقام پر ہجرت کر جاتے ہیں۔ بعض اوقات علاقے میں ایک ہی قسم کے پودوں یا جانوروں کی کثرت سے غذائی مسائل جنم لینے لگتے ہیں تو جانور ہجرت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان نامناسب حالات میں کچھ پودے یا جانور اپنی نسل کی بقا کے لئے محفوظ علاقے کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔ جنوبی علاقوں کے بہت سے پرندے جن میں بطخ، ہنس اور کلنگ وغیرہ شامل ہیں، سردیوں کے موسم میں گرم علاقوں کی طرف آنکلتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے انہیں کئی کئی سو میل کا سفر روزانہ طے کرنا پڑتا ہے۔

پرندوں اور جانوروں کے برعکس پودے اور چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے طاقتِ پرواز سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں بھی اپنی نسل کی بقا کے لئے محفوظ اور ساز گار ماحول درکار ہوتا ہے، اس مقصد کے لئے یہ نہایت دلچسپ طریقے اختیار کرتے ہیں۔

بہت سے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے دور دراز مقام تک پہنچ جاتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں امریکی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سائنس دانوں نے یہ بات معلوم کی کہ ایک خاص قسم کے کیڑے "اسکیل انسیکٹ" کے بچے ہوا میں اُڑنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ یہ کیڑا اپنے انڈے آئس پلانٹ کے پودے پر دیتا ہے۔ ان انڈوں سے بہت ہی چھوٹے پروں سے محروم بچے نکلتے ہیں۔ صرف ۲ دن بعد یہ بچے آئس پلانٹ کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ نہایت دلچسپ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ آئس پلانٹ کے اس حصّے پر آجاتے ہیں جو روشنی میں ہوتا ہے۔ ہوا کا رُخ معلوم کرنے کے لئے اسکیل انسیکٹ کے یہ ننھے بچے انٹینا لہرا کر ہوا کا رُخ اور رفتار معلوم کر لیتے ہیں پھر وہ اپنے جسم کو کمان کی طرح اونچا کرتے ہیں اور سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہوا کے جھونکے ان کو اُڑا کر ساز گار ماحول میں پہنچا دیتے ہیں۔

کینیڈا اور امریکہ میں پایا جانے والا پتنگا (MOTH) بھی ہوا کو وسیلۂ سفر بناتا ہے۔ اس کیڑے کے انڈوں سے لاروا نکلتا ہے۔ لاروا نکلنے کے بعد یہ درخت کی اونچی ٹہنیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور اپنے جسم سے باریک باریک ریشمی دھاگے نکالتے ہیں۔ ہوا میں لہراتے ہوئے یہ دھاگے ان

لاروں کو اٹھالے جاتے ہیں۔ کئی کلو میٹر کا سفر یہ لاروے اسی طرح ہوا میں تیرتے ہوئے کر لیتے ہیں اور نئے مقام تک پہنچ جاتے ہیں جہاں یہ کیڑے رینگتے ہوئے دوبارہ درختوں، پودوں اور پیڑوں پر چڑھ جاتے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں مس پسی کے سائنس دانوں نے یہ حیرت ناک اطلاع دی کہ ایشیائی گھونگھے (SNA-ILS) "زیرِ آب پیراشوٹ" کی مدد سے امریکہ کی جانب بڑھے چلے آرہے ہیں۔ یہ گھونگھے بحری سفر کے لئے بالکل امریکی پتنگوں کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ گھونگھے بہت باریک ریشوں سے پیراشوٹ تیار کرتے ہیں اور پانی کے بہاؤ کو محسوس کر کے فوراً جسم کا زور لگا کر پانی کے بہاؤ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گھونگھوں سے نکلنے والے یہ ریشے ایک پتنگ کا سا کام دیتے ہیں جو، ان گھونگھوں کو بالائی سطح پر لے آتی ہے۔ اس طرح یہ ننھے گھونگھے پانی کے اندر ہی اندر ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک منتقل ہو جاتے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں کے علاوہ کئی پودوں کو بھی اپنی نسل کی بقا کے لئے ہوائی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ فنجائی (FUNGI) کی ایک قسم اور آرکڈ کے بیج نہایت ہی مہین اور ہلکے ہوتے ہیں۔ ہوا کا ایک ہی جھونکا انہیں اُڑا کر کئی کلو میٹر دور لے جاتا ہے۔ ککروندے اور آرک کے بیج پر لمبے لمبے بالوں کے ریشے ہوتے ہیں جو انہیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اُڑنے میں مدد دیتے ہیں۔

کرنیں

○ ..... پستی کو حقیر مت جانو اس نے بلندی کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔

(رسکن)

○ ..... ایک شریفانہ جواب تحمل اور خاموشی ہے۔

(ٹینی سن)

○ ..... تم جہاں چاہو زمین کھود لو، خزانہ تمہیں ضرور ملے گا شرط صرف یہ ہے کہ زمین کامیابی کے یقین کے ساتھ کھودو۔

(خلیل جبران)

○ ..... یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے۔ وقت ٹھہرا رہتا ہے ہم گزر جاتے ہیں۔

(آنسن ڈانس)

○ ..... جس کی پیدائش پنجرے میں ہوئی اس کے لئے پنجرہ ہی علامتِ آزادی ہے۔

(یوجینی یوٹو شنکر)

○ ..... جو خدا کا وفادار نہیں وہ کسی سے وفا نہیں کر سکتا ہے۔

(امام غزالیؒ)

○ ..... اللہ خوشحالی بخشے تو اپنی آرزوؤں کو وسیع نہ کرتے جاؤ۔

(براؤن)

○ ..... زمین میں بیج ڈالو۔ وہ تمہارے لئے پھول کے خزانے اگل دے گی۔

(خلیل جبران)

○ ..... پرانے کوٹ سے کام چل جائے گا چند نئی کتابیں خرید لیجئے۔

(آنسن فلپ)

صنوبر کے بیج میں پر لگے ہوتے ہیں۔ چھوٹی موئی (SCOTH BROOM) اپنے بیجوں کو پھیلانے کے لئے بالکل جدا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جب ان پودوں کی پھلیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں تو کھنچاؤ کے باعث یہ پھلیاں زور سے پھٹ پڑتی ہیں اور دھماکے کے ساتھ ہی ان کے بیج کئی کلو میٹر دور تک جا گرتے ہیں اور انکی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔

ساحلوں کے کنارے لگے ناریل کے درختوں سے ناریل ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرتے رہتے ہیں جہاں سے لہریں انہیں بہا کر دوسرے کناروں پر لے جاتی ہیں اور وہاں ان کی نمو شروع ہو جاتی ہے۔

جانور اور پرندے بھی کیڑے مکوڑوں کی بقا اور پودوں کی نشوونما کے لئے نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بہت سے پھل خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ جانور اور پرندے ان پھلوں کو بیجوں سمیت کھا جاتے ہیں مگر ان کے سخت بیج پرندوں کو ہضم نہیں ہوتے اور فضلے کے ساتھ نکل جاتے ہیں۔ بیجوں کے اخراج کی یہ جگہ اس مقام سے خاصی دور ہوتی ہے جہاں جانوروں نے یہ بیج کھائے تھے۔ پرندوں کے ذریعے بیجوں کے منتقلی کا ایک دلچسپ نظارہ ۱۹۶۰ء میں نظر آیا۔ آئس لینڈ کے قریب آتش فشاں پھٹنے سے ایک جزیرہ اُبھر آیا۔ یہ غیر آباد جزیرہ جو "سرسٹی" کے نام سے پہچانا گیا بالکل بنجر تھا۔ آتش فشانی راکھ اور گرم گرم لاوے نے ہر قسم کی زندگی کی نمو کو ناممکن بنا دیا تھا مگر چند ہی سال بعد یہ بنجر جزیرہ سرسبز علاقے میں تبدیل ہو گیا اور یہ ان پودوں کے بیجوں کی وجہ سے ہوا جو پرندوں کے ذریعے اس جزیرے پر منتقل ہوئے۔

امربیل پر بے حد ذائقہ دار پھل نکلتے ہیں یہ بے حد لیس دار ہوتے ہیں جب پرندے ان پھلوں کو کھاتے ہیں تو لیس انکی چونچ پر لگ جاتا ہے جسے چھڑانے کے لئے وہ درختوں پر اپنی چونچیں رگڑتے ہیں اس عمل سے پھلوں سے بیج الگ ہو کر دور دور پھیل جاتے ہیں۔

کتاب فطرت کا ہر اوجھل ورق پودوں اور جانوروں کی زندگی کی بقا کی ایک نئی کہانی سناتا ہے جو جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی حیرت انگیز بھی ہے۔

لومڑی کی کھال

ہالی وڈ کی ایک اداکارہ ایک دکان پر لومڑی کی کھال کا کوٹ خریدنے گئی۔ دیر تک جھک جھک اور بک بک کرنے کے بعد اس نے کوٹ پسند کر لیا۔ دام چکائے اور پوچھا:

"یہ بارش میں بھیگ کر خراب تو نہیں ہو جائے گا۔"

دکاندار جو پہلے ہی اس کی بے تکی بحث سے تنگ آچکا تھا جھلا کر بولا: "محترمہ آپ نے کسی لومڑی کو بارش میں چھتری لگائے ہوئے دیکھا ہے؟"

مرسلہ: عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

گندے گھر میں اچھے بھائی

سیما صدیقی

اچھے بھائی پہلی بار صفو آپا کے گھر آئے تھے۔ یہ صفو آپا کے دور پار کے بھائی ہوتے تھے۔ سادہ اور نفیس طبیعت کے آدمی تھے۔ ہر کام طریقے سلیقے سے کرنے کے عادی اور نہایت صفائی پسند۔

ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صفو آپا کے گھر صحت و صفائی کی صورت حال اتنی خراب ہوگی۔ اس گھرانے کا غالباً منشور ہی یہ تھا

؎ گندگی ہے، پڑی رہنے دو
زندگی رہی تو صفائی ہو گی

گھر کے ہر کمرے میں دیوار گیر گھڑیاں آویزاں تھیں مگر سب پہ اتنے جالے لگے ہوئے تھے کہ کسی میں بھی وقت دیکھنا ممکن نہ تھا۔ معلوم نہیں یہ لوگ وقت کیسے دیکھتے تھے؟

پہلے ہی دن جب اچھے بھائی سفر سے تھکے ماندے صوفے پہ گرے، تو صفو آپا نے ان کی

حالت دیکھتے ہوئے چائے کی فراخ دلانہ پیش کش کی۔ (بعد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں کسی کو چائے کے لئے پوچھنا بھی نہایت فراخ دلی کی بات تھی) اچھے بھائی نے بلا تامل یہ پیش کش قبول کرلی۔ صفو آپا نے بیک وقت کئی لڑکیوں کو چائے بنانے کا حکم دیا "ارے گڈی..... لاڈو..... چمو..... ذرا اچھے ماموں کے لئے چائے تو بنالاؤ..... فٹافٹ!"

بہت دیر گزر گئی مگر چائے کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ہر ایک یہ سوچ رہا تھا کہ ہم ہی کیوں بنائیں..... کوئی دوسرا کیوں نہ بنائے؟

"آپا اگر چائے میں دیر ہے تو میں ذرا آرام کر لوں۔" اچھے بھائی نے سلیقے سے چائے کی یاد دلائی۔ صفو آپا بچوں کو کوستی ہوئی خود ہی باورچی خانے میں گھس گئیں اور چائے بنانے کے بجائے چائے پکانے میں لگ گئیں۔ کافی دیر بعد باورچی خانے سے برآمد ہوئیں تو ایک ہاتھ میں چھلکتی چھلکاتی چائے کی پیالی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چیوڑے کی پلیٹ۔ چیوڑا اتنا پرانا تھا کہ اب بالکل کوڑا لگ رہا تھا۔ اچھے بھائی نے چیوڑے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہیں لگا کہ جیسے چیوڑا ہولے ہولے ہل رہا ہو اور اس میں موجود کیڑے سر ہلا ہلا کر اچھے بھائی کو چیوڑے سے دور رہنے کا مشورہ دے رہے ہوں۔ اچھے بھائی نے ہاتھ کا رخ تبدیل کر کے چائے کی پیالی تھام لی۔ مگر یہ کیا! اچانک ان کی نظر چائے میں تیرتی ننھی منی سی کالی چیز پر پڑی..... کچھ لمحے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے بیٹھے رہے کہ کیا کریں؟ میزبان کو شرمندگی سے بھی بچانا چاہتے تھے اور آنکھوں دیکھی "چیونٹی" بھی نہیں نگل سکتے تھے۔ چنانچہ بات کو مزاح کا رنگ دے کر بولے۔

"ارے دیکھیں تو آپا! چائے میں چیونٹی اپنا ساتواں چکر مکمل کر رہی ہے....."

"چیو..... نٹی.....!" آپا نے حیرت کا مظاہرہ مناسب سمجھا "ذرا دیکھوں تو....."

پھر چائے کی پیالی میں جھانکتے ہوئے بولیں "ائے ہٹو! یہ تو مری ہوئی ہے!" آپا مطمئن ہو کر دوبارہ تخت پہ جا بیٹھیں۔

"مری ہوئی ہے یا زندہ ہے..... مگر چیونٹی چائے میں کر کیا رہی ہے؟" اچھے بھائی آپا کی بے نیازی پہ جھلا گئے۔

"ائے بھیا! چیونٹی ہی ہے نا..... کوئی مکھی تو نہیں!" آپا نے نیا نکتہ اٹھایا۔

"مگر آپا! چیونٹی بھی تو کیڑا ہی ہے نا..... ویسے بھی چیونٹی میں نائٹرک ایسڈ ہوتا ہے جو انسانوں کے لئے زہر ہے۔"

"ارے بھئی! اس ننھی سی جان میں بھلا کتنا نائٹرک ایسڈ ہوگا جو جان پہ بن آئے۔ لاڈو کے ابا کی چائے میں تو ایک نہیں کئی کئی چیونٹیاں تیر رہی ہوں ذرا خاطر میں نہیں لاتے..... پھونکیں مار کے ہٹاتے رہتے ہیں، مجال ہے جو ایک چیونٹی بھی منہ

میں چلی جائے۔"

"مگر آپا! مجھ سے تو "پھونکوں سے چیونٹیوں کو ہٹایا نہ جائے گا"۔ اچھے بھائی نے چائے میز پر رکھ دی۔ گویا صبر کر لیا۔

"اے لو! چائے کیوں رکھ دی..... میں ابھی نکالے دیتی ہوں....."

اچھے بھائی نے ٹھنڈی سانس بھری کہ اب ضرور چمچے کی ڈھونڈیا مچے گی۔ مگر صفو آپا اٹھیں اور انگلی کی پور چائے میں گھسا کے چیونٹی نکالتے ہوئے بولیں:۔

"لو دیکھو بھلا! یہ چیونٹی ہے..... پتی ہے پتی چائے کی.....!"

چیونٹی ہو یا پتی..... اب تو چائے میں انگلی ڈال کر ویسے بھی چائے کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ اچھے بھائی نے پیالی کھسکا کر مزید دور کر دی۔

"ارے بڑی وہمی ہو تم بھی..... کہا نا! پتی ہے پتی۔"

"ہاں اور کیا پتی ہی تو ہے!" صفو آپا کے سب بچے یعنی سارے میزبان ایک طرف ہو گئے اور اچھے بھائی اکیلے پڑ گئے۔ سامنے پرچ میں ابھی تک چائے کی پتی الٹی پڑی اپنی چھ ٹانگیں ہلا کر سیدھا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچھے بھائی جلدی سے اٹھے اور نہانے گھس گئے۔ صفو آپا نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"ارے بھئی ایسے نخرے والے مہمانوں سے تو توبہ ہی بھلی..... اچھی بھلی چائے پڑی کی پڑی رہ گئی ..... بیٹا لاڈو اسے تھرماس میں رکھ دو..... تمہارے ابا آتے ہی ہوں گے۔"

کچھ دن یہاں رہ کر اچھے بھائی کو احساس ہوا کہ میزبان اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ ڈیپ فریزر اور ریفریجریٹرز کی انقلابی ایجادات محض اس لئے کی گئیں کہ ان میں رکھا ہوا بدمزہ کھانا کئی روز تک پڑے رہنے کے باوجود مزید بدمزہ یا باسی نہیں ہوتا۔ جتنے دن چاہو رکھو پھر نکال کر گرما لو۔

کھانے کے بعد صفو آپا نے فرج سے تین سیب برآمد کئے۔ سیبوں کی حالت زار کچھ ایسی تھی کہ انہیں ایک ہفتہ پہلے پھینک دیا جانا چاہئے تھا۔ بہر حال صفو آپا نے کسی سلیقہ مند خاتون کی طرح چاقو سنبھالا اور سیب چھیلنا شروع کئے۔ ساتھ ہی سیب کے گلے سڑے حصے الگ کرتی گئیں۔ آخر میں جب پلیٹ کی طرف دیکھا تو صرف گلے ہوئے چھلکے پڑے تھے (کیونکہ صاف حصہ کوئی تھا ہی نہیں) صفو آپا نے نظر ثانی کے بعد اس میں سے چند ٹکڑے نکالے اور اچھے بھائی کو پیش کئے بقیہ سیب کے چھلکوں کو چاقو سے کریدتے ہوئے بولیں.....

"یہ جو چھلکے ہیں نا، ان کی بڑی مزے دار بھجیا بنتی ہے۔"

"کک..... کیا!" اچھے بھائی لرز اٹھے "مم..... میں بھجیا نہیں کھاتا بلکہ مجھے بھجیا سے نفرت ہے....."

"اچھا تو یہ سیب تو کھاؤ نا!" صفو آپا نے اصرار کیا۔ اچھے بھائی نے مجبوراً سیب کا ایک ٹکڑا اٹھا کر

منہ میں ڈال لیا انہیں ایسا لگا جیسے سڑا ہوا آلو کھا رہے ہوں۔ بمشکل تمام وہ قاش حلق سے اتار کر بولے "آپا! سیب بچوں کو کھلائیں بڑھتے ہوئے بچوں کو پھل کی ضرورت ہوتی ہے ..... مجھے تو ویسے بھی سیب پسند نہیں (حقیقت یہ تھی کہ سیب تو پسند تھا فوڈ پوائزن پسند نہیں تھا)

"اچھا تو لاڈو ..... ارے لاڈو ..... اپنے اچھے ماموں کو مٹھائی کھلا دو۔" آپا خاطر داری پہ تلی ہوئی تھیں۔ لاڈو..... کو اتنا لاڈ پیار دیا گیا تھا کہ اس نے اماں کی بات کا جواب دینا بھی ضروری نہ سمجھا اور بیٹھی لوڈو کھیلتی رہی۔ آخر آپا نے منجھلی لڑکی کو آزمایا۔ "بیٹا گڈی ..... ذرا فرج سے مٹھائی تو نکال لاؤ ..... ماموں کے لئے۔" گڈی نے دھڑ سے فرج کھولا اور مٹھائی کا ڈبہ نکال کر ماموں کے سامنے پٹخ دیا۔

اچھے بھائی نے محسوس کیا اس گھرانے میں مکمل طور پر "پٹخاؤ سسٹم" رائج ہے۔ ہر چیز مہمان کے سامنے جیسی ہے اور جہاں ہے کی بنیاد پہ پٹخ دی جاتی ہے۔ نہ چمچہ نہ کوارٹر پلیٹ نہ ہی مہمان کو ناشتے کی پلیٹ اٹھا کر پیش کرنے کا رواج تھا۔ مثلاً چیوڑا ایک بڑی پلیٹ میں لا کر دور میز پر پٹخ دیا جاتا۔ اب چیوڑا اتنا پسندیدہ آئیٹم بھی نہیں (اور وہ بھی ان کے گھر کا چیوڑا) کہ جس کی خاطر مہمان بار بار اُچک اُچک کر میز پر جائے ..... مٹھی بھر بھر کر چیوڑا اٹھائے اور پھر صوفے پہ بیٹھ کر کھائے .....

"لو نا!" آپا نے ازراہِ عنایت سروتے سے ڈبے کا ڈھکن ہٹا دیا اچھے بھائی نے بادلِ نخواستہ ایک لڈو اٹھایا تو ایک چھوٹا سا لال بیگ ہڑبڑا کر ڈبے سے نکل کر بھاگا۔ غالباً وہ اسی لڈو کے نیچے لیٹ کر آرام کر رہا تھا اور اچھے بھائی اس کے آرام میں مخل ہوئے تھے۔

اچھے بھائی اس نتیجے پہ پہنچے کہ صفو آپا کے بچوں سے زیادہ مہذب اور تربیت یافتہ اس گھر کے لال بیگ اور چیونٹے ہیں، بیچارے جونہی دیکھتے ہیں کہ وہ جس چیز پہ محوِ استراحت ہیں اسے مہمان کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے تو فوراً راستہ دے کر الگ ہٹ جاتے ہیں۔

صفو آپا نے بھاگتے ہوئے لال بیگ پہ سروتا مارتے ہوئے قدرے خجالت سے کہا۔

"کم بخت فرج میں بھی گھس جاتے ہیں..... پورے گھر پہ انہوں نے قبضہ کیا ہوا ہے....."

اچھے بھائی نے سوچا جس گھر میں صفائی ستھرائی کی صورت حال اتنی ابتر ہو وہاں کیڑے مکوڑوں کا راج نہ ہو تو حیرت ہے۔ لال بیگ اور جھینگروں کی موجودگی میں قصور ان کیڑوں کا نہیں ہوتا بلکہ ان مکینوں کا ہوتا ہے جو اپنے گھروں میں کیڑوں کو پھلنے پھولنے کے لئے ساز گار ماحول فراہم کرتے ہیں۔

"ارے میٹھا کھانے کا موڈ نہیں تو چیوڑا منگوا دوں۔ منہ نمکین ہو جائے گا....." صفو آپا نے کہا "نن..... نہیں..... میں سونے جا رہا ہوں" ..... اچھے بھائی نے پسینہ پونچھتے ہوئے گڑبڑا کر کہا اور لڈو

ڈبے میں واپس رکھ کر کمرے میں بھاگے۔

چھوڑا اچھے بھائی کے اعصاب پہ ایسا سوار ہوا کہ خواب میں بھی انہیں چھوڑا ہی دکھائی دیا...... انہوں نے دیکھا کہ آپا ایک تھال میں مختلف اقسام کے کیڑے مکوڑے بھر کر لائیں۔ اچھے بھائی بیک وقت اتنے سارے کیڑے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے

...... "یہ کیا...... کیڑے......؟"

"ارے یہ چھوڑا ہے چھوڑا...... کیڑا نہیں...... تمہیں یاد نہیں بچپن میں کتنے شوق سے کھایا کرتے تھے۔"

"اوہ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے بچپن والا چھوڑا آپ نے ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ بڑے ہو کر پچیس سال پرانا چھوڑا کھانا پڑے گا تو میں اپنے بچپن میں ہی اسے کھا کر ختم کر دیتا۔ اچانک بیک گراونڈ سے خوفناک بازگشت سنائی دیتی ہے۔

"چھوڑا...... چھو...... ڑا...... ڑا...... ڑا...... کھاؤ

...... کھاؤ...... آؤ...... بچاؤ...... جاؤ...... جاؤ......"

اور اچھے بھائی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

اچھے بھائی کو حیرت تھی کہ صفو آپا کے سب بچے زندہ تھے...... یعنی کسی کو بھی یہ سڑی گلی غیر صحت بخش اشیا کھا کر "کچھ" نہیں ہوا تھا۔ لیکن اچھے بھائی اس گھر کا پہلا شکار نہیں بننا چاہتے تھے چنانچہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر واپسی کا ارادہ کیا۔ صفو آپا نے بہت پوچھا کہ بھیا، بہن سے کیا خطا ہو گئی...... کوئی بات ناگوار گزری یا خاطر داری میں کوئی

ذرا سوچیں تو!

○ ...... سونے پر زنگ لگ جائے تو کس طرح دور ہوتا ہے ؟

○ ...... وہ کون سا لفظ ہے جو ہمیشہ غلط بولا جاتا ہے ؟

○ ...... وہ کون سی چیز ہے جس کے گرنے سے چوٹ نہیں لگتی ؟

○ ...... کون دن میں کئی مرتبہ شیو بناتا ہے ؟

○ ...... ذرا جلدی سے بتائیے آپ سو کر اٹھنے سے پہلے کیا کرتے ہیں ؟

○ ...... وہ کون سا پرندہ ہے جس کے سر پر پیر ہوتے ہیں ؟

جوابات

سونے کو زنگ نہیں لگتا، غلط، بارش، حجام
سوتے ہیں، ہر پرندہ سر پر اور، پیر رکھتا ہے۔
(مرسلہ۔ محمد رومان بیگ۔ فیصل آباد)

کسر رہ گئی؟ اب بھلا بھیا کیا کہتے!

ان کے جانے کے بعد لاڈو بولی۔ "اماں آپ تو کہہ رہی تھیں کہ یہ اچھے ماموں ہیں۔ بھلا ایسے ہوتے ہیں اچھے ماموں...... نک چڑھے اور سو نخروں والے...... یہ تو اچھے ماموں نہیں بلکہ سڑیل ماموں تھے...... سڑیل!"

"ہاں بالکل سڑیل......" سب بچوں نے متفقہ فیصلہ سنا دیا اور صفو آپا ابھی تک الجھن میں تھیں کہ دراصل سڑیل کون ہے؟

ایڈز
انسان کا قاتل

علی حیران

"ایڈز" کی دہشت سے آج ساری دنیا خائف ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جو کسی حد بندی کی محتاج نہیں۔ اگرچہ زیادہ تر افریقہ، امریکہ، تھائی لینڈ اور مغربی ممالک ہی اس کی گرفت میں ہیں لیکن ایشیائی ممالک اور پاکستان بھی اس بیماری کے خطرے سے دو چار ہیں۔

"ایڈز" دراصل "ایکوائرڈ امیونو ڈیلیٹی شنسی سنڈروم" کا مخفف ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "ایسا مرض جس سے جسم کا حفاظتی نظام تہہ و بالا ہو جاتا ہے"۔

یہ بیماری ایک قسم کے وائرس سے پھیلتی ہے جسے "ایچ آئی وی" کا نام دیا گیا ہے۔ ایچ آئی وی دراصل "ہیومن امیونو ڈلفی شنسی وائرس" کا مخفف ہے۔ ایڈز کا مرض بیسویں صدی عیسوی

میں پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مرض دنیا میں پہلے سے موجود تھا؟ اور یہ کیونکر پھیلا؟ اس کے متعلق دو باطل نظریات ہیں۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ وائرس، ایچ آئی وی، بندروں کے خون میں موجود تھے جس سے یہ انسان میں منتقل ہوگئے۔ چوں کہ براعظم افریقہ کے جنگلات بندروں سے بھرے پڑے ہیں اسی لئے سب سے پہلے افریقی ممالک کے لوگ ہی اس کا شکار ہوئے۔

دوسرے نظریہ کے مطابق بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے سے قبل یہ وائرس ہماری دنیا میں موجود نہیں تھے اور نہ ہی اس بیماری کا کوئی وجود تھا، بلکہ یہ وائرس خلا سے آیا ہے۔ یا "جینیاتی تجربات" کے دوران اتفاقیہ طور پر پیدا ہو گیا ہے۔

ایڈز کے وائرس جب جسم میں داخل ہوتے ہیں تو وہ بیماریوں کا مقابلہ کرنے والی قوت کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس طرح اس بیماری کا شکار ہونے والا کسی بھی مرض کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مریض دن بدن لاغر اور کمزور ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر کار موت اسے دبوچ لیتی ہے۔

ایچ آئی وی چھوت کے کم سے کم چار مرحلے ہوتے ہیں۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ یہ مرحلے یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں۔ اس کے پہلے مرحلے میں مرض پوری شدت سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں اس کی علامات دب جاتی ہیں اور تیسرے مرحلے میں "ملفی غدود" سوج کر رسولیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

چوتھے اور آخری مرحلے میں ایڈز کی مخصوص پیچیدگیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ یعنی ملفی غدود اور "تلی" سوج جاتی ہیں، پیچش آتے ہیں اور جلد متاثر ہوتی ہے۔

ابھی تک اس مرض کی شناخت کا ذریعہ محض ایک مخصوص ٹیسٹ ہے لیکن یہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور اس پر اخراجات بھی بہت اٹھتے ہیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ایڈز ہاتھ ملانے اور مشترکہ غسل خانے استعمال کرنے سے پھیلتا ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ البتہ ایڈز میں مبتلا افراد کے خون کے ذریعے یہ مرض دوسروں کو لگ جاتا ہے۔

آلاتِ جراحی بھی اگر آلودہ ہوں تو ان سے بھی دوسرے لوگ اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق امریکہ میں تقریباً پچاس لاکھ افراد اس کا شکار ہیں اور باقی دنیا میں تقریباً سوا کروڑ افراد اس مرض میں مبتلا ہیں۔ افریقہ میں ایڈز کی ہولناکیاں سب سے زیادہ ہیں۔

ایڈز کے شکار افریقی ممالک میں "برونڈی، تنزانیہ، آئیوری کوسٹ، روانڈا، یوگنڈا، جمہوریہ افریقہ، زائرے اور کینیا شامل ہیں۔ کُلی طور پر دنیا کے تقریباً پندرہ فیصد ایڈز کے مریض افریقہ میں ہیں۔

تمہارا سو سو کلو وزن ہے تو میرا بھی پتھر نما پیٹ ہے

ضرورت سے زیادہ کھانے والے کو پیٹو کہتے ہیں۔ لیکن اس آدمی کو آپ کیا کہیں گے جس کا پیٹ لوہے کی طرح مضبوط ہو۔ ۳۵ سالہ مائیک ڈیٹسن ایک ایسا ہی آدمی ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ آٹھ فٹ کی بلندی سے ۲۳۰ پونڈ وزنی آدمی نے مائیک ڈیٹسن پر چھلانگ لگائی اور مائیک ڈیٹسن صاحب کا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ مسکراتے ہوئے اٹھے اور اٹھ کر چھلانگ لگانے والے کرائے انسٹرکٹر سے مصافحہ کیا۔ مائیک ڈیٹسن کچھ عرصہ پہلے مسٹر امریکہ بھی رہ چکے ہیں۔

سترہ روزہ جنگ میں پاک فضائیہ کے کارنامے

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

محمد عظیم قریشی

نشانہ ہلواڑہ

مشن کے قائد: سکواڈرن لیڈر سرفراز رفیقی

ساتھی ہواباز: فلائیٹ لیفٹیننٹ سہیل چوہدری

فلائیٹ لیفٹیننٹ یونس حسین

ہدف: ہلواڑہ کا ہوائی اڈہ

تاریخ: ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

وقت: ۵ بجکر ۱۵ منٹ

طیارے: ایف ۸۶

کارکردگی: بھارت کے علاقے میں دشمن کے ۱۲ طیاروں کے ساتھ فضائی معرکہ ہوا۔ جس میں دشمن اپنے ۵ ہنٹر طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

نقصان: اس معرکے میں سکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی کے طیارے کی مشین گنیں جام ہو گئیں اور وہ شہید ہو گئے۔

انتہائے کمال

قائد مشن۔ اسکواڈرن لیڈر محمد محمود عالم۔

نائب۔ فلائنگ آفیسر مسعود اختر۔

تاریخ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء۔

طیارہ۔ ایف ۸۲۔
ہدف۔ فضائی مستقر سرگودھا پر حملہ آور بھارتی طیاروں کے خلاف کارروائی جن میں سے چار طیاروں کو ایک ہی ہلّے میں زمین بوس کر دیا۔ اس طرح ایک مہم میں دشمن کے پانچ ہنٹر طیارے تباہ کر کے ایم ایم عالم نے ہوا بازی کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ وہ ایک بہادر شاہین تھے۔
نقصان۔ صفر۔

گورداسپور کا فضائی معائنہ

مشن کے سربراہ۔ اسکواڈرن لیڈر علاء الدین احمد۔
ساتھی ہوا باز۔ فلائٹ لیفٹیننٹ سلیم۔ امان اللہ اور عراف منظوری۔
مشن۔ گورداسپور کے علاقے کا جاسوسی گشت کرنا۔
کارکردگی۔ گورداسپور کے ریلوے اسٹیشن پر اسلحہ سے بھری ہوئی ٹرین کو تباہ کر دیا۔
نقصان۔ سکواڈرن لیڈر علاء الدین احمد کا طیارہ اسلحہ کے ٹکڑوں کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا اور آپ دشمن کے علاقے میں شہید ہو گئے۔

بھارتی بری فوج پر پہلی ضرب

مشن کے قائد۔ اسکواڈرن لیڈر سید سجاد حیدر۔
ساتھی ہوا باز۔ فلائنگ آفیسر ایم۔ ارشد چوہدری، خالد لطیف خان، فلائٹ لیفٹیننٹ ایم اکبر، دلاور حسین اور غنی اکبر۔
تاریخ۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء۔
مشین۔ لاہور کی طرف پیش قدمی کرنے والی بھارتی بری فوج کے بکتر بند ڈویژن کا خاتمہ۔
کارکردگی۔ بیس منٹ کے مسلسل حملے کے ذریعے دشمن کے بہت سے ٹینک اور دوسری فوجی گاڑیوں کو تباہ کر دیا گیا۔
نقصان۔ صفر۔

پٹھان کوٹ پر تاریخی حملہ

مشن کے قائد۔ سکواڈرن لیڈر سید سجاد حیدر۔
فلائٹ لیفٹیننٹ محمد اکبر۔
تاریخ۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء۔
ہدف۔ انڈین ائیر فورس بیس (پٹھان کوٹ)۔
طیارے۔ ایف ۸۲۔
کارکردگی۔ اس مہم میں دشمن کے زمین پر ۱۲ طیاروں کو تباہ کر دیا گیا اس کے علاوہ نقل و حمل کے دو طیاروں اور فضائی ٹریفک کنٹرول کے شعبے کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔
نقصان۔ صفر۔

فضائی جھڑپ کا باقاعدہ آغاز

مشن کے قائد اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی۔
نائب فلائٹ لیفٹیننٹ امتیاز احمد بھٹی۔
تاریخ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء۔
طیارے۔ ایف ۸۲۔
مشن۔ دشمن کے طیاروں کے ساتھ معرکہ آرائی۔

کارکردگی۔ فضائی جھڑپ کے دوران چھمب کے علاقے میں دونوں ہوابازوں نے یکساں طور پر دو دو ہندوستانی "ریپائر" کو تباہ کر دیا۔
نقصان۔ صفر۔

انبالہ پر حملہ

قائد مشن۔ اسکواڈرن لیڈر نجیب احمد خان۔
ساتھی ہوا باز۔ اسکواڈرن لیڈر اورنگ زیب خان اور نذیر بن لطیف۔
ہدف۔ انبالہ۔
طیارے۔ بی ۵۷ بمبار طیارے۔
کارکردگی۔ دشمن کی طیارہ شکن توپوں کی زبردست فائرنگ کے باوجود بمباری بالکل کامیاب رہی۔ صحیح نشانوں پر بمباری نے چاروں طرف تاحد نظر آگ پھیلا دی اور دشمن کو شدید نقصان سے دو چار ہونا پڑا۔

بھارتی چھ ہنٹر طیاروں سے مقابلہ

لڑاکا ہوا باز۔ فلائٹ لیفٹیننٹ امجد حسین خان۔
طیارہ۔ ایف ۱۰۴ اسٹار فائٹر۔
تاریخ۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء۔
مہم۔ دشمن کے چھ ہنٹر طیاروں کے خلاف کارروائی۔
کارکردگی۔ پی اے ایف مستقر سرگودھا پر حملہ آور طیاروں کی یلغار کو صرف تنہا اسٹار فائٹر نے روک دیا اور دو طیاروں کو تباہ بھی کر دیا۔ یہ کارنامہ پاکستانی ہوا باز امجد حسین خان نے سرانجام دیا۔

نقصان۔ کوئی نقصان نہیں ہوا۔

مجموعی کارکردگی

سترہ روزہ جنگ میں پاک فضائیہ کو عظیم کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ہمارے شاہینوں نے دشمن کا بے جگری سے مقابلہ کیا اور اسے منہ توڑ جواب دیا۔ جنگ کے اختتام پر بھارتی فضائیہ اپنے بہت زیادہ طیاروں سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس لئے پاکستانی فضائیہ نے فضاؤں میں اپنی برتری قائم رکھ کر ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ جنگ کے اختتام پر دشمن کے حوصلے دم توڑ چکے تھے اور یوں وہ پوری طرح پاک فضائیہ کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر جنگ جاری رہتی تو پاک فضائیہ بھارتی ائیر فورس کے پرخچے اڑا دیتی۔

پاکستان کے ہوا بازوں کے حوصلے جنگ کے دوران بلند رہے۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی کے معاہدے کے ساتھ ہی پاک فضائیہ کی حربی سرگرمیاں بھی رک گئیں اور یوں ایک سرنگوں دشمن کے سامنے ہمارے شاہینوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ مل سکا۔

آنکھ مچولی کے مجلس ادارت کے رکن اور بچوں کے مقبول ادیب جناب منیر احمد راشد کی کہانیوں کا مجموعہ "ہم بنے کمانڈو" بھارت کے معروف اشاعتی ادارے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ سے شائع ہو گیا ہے۔ اس مجموعے میں راشد کی سات کہانیاں شامل ہیں۔

مناسب دام - بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبرشپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھیے۔
- مشرقِ وسطیٰ کیلئے ۔۔۔ ۴۰۰ روپے
- امریکہ اور یورپ کیلئے ۔۔۔ ۵۰۰ روپے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

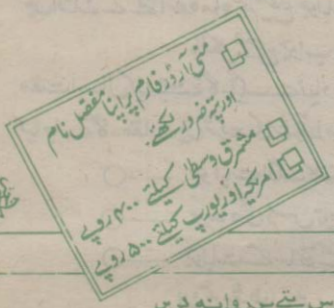

ماہ نامہ آنکھ مچولی - 1 - پی - آئی - بی کالونی، کراچی - ۵

عکس اَدھورے کیجئے پورے

اچھے ساتھیو!

حسبِ وعدہ اس ماہ سے ہم آپ کے لئے کوئز کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ اس انعامی مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک ہی شعبے سے تعلق رکھنے والی، دنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کریں گے۔ آپ کو اِن شخصیات کو پہچاننا ہوگا اور ان کی وجہ شہرت بتانا ہوگی۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لئے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔

بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو ایک سال کے لئے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست جواب ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

- جوابات الگ کاغذ پر، صاف صاف لکھے ہوں۔
- ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا۔

پتہ: انچارج انعامی مقابلہ۔ عکس ادھورے کیجئے پورے
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔ ۷۴۸۰۰

میرے کشمیر ہم تیرے لئے ہیں

نوید مرزا

بہت سے دست و بازو کٹ چکے ہیں
مگر سب حوصلے سے جی رہے ہیں
لہو میں آگ ہے، دُکھ ہیں، فغاں ہے
ترا پرچم اُٹھائے چل رہے ہیں
مرے کشمیر ہم تیرے لئے ہیں

تجھے آزاد ہم کر کے رہیں گے
تری خاطر جئیں گے اور مریں گے
تیری تعمیر کا وعدہ کیا ہے
تجھے مسلم ہم ہونے نہ دیں گے
مرے کشمیر ہم تیرے لئے ہیں

تجھے برباد ہم ہونے نہ دیں گے
تری خوشبو کو ہم کھونے نہ دیں گے
ہمارا حوصلہ جب تک جواں ہے
ترے بچّوں کو ہم رونے نہ دیں گے
مرے کشمیر ہم تیرے لئے ہیں

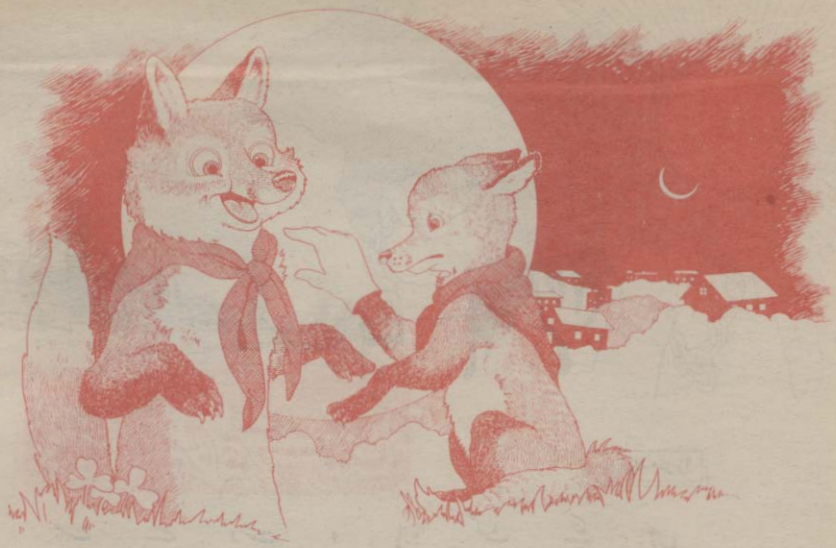

دستانے خریدنے کے لیے

تحریر: نان کی چی نی می

ترجمہ: جونکو واتا سے

ایک جاپانی کہانی جس کا اردو ترجمہ ایک جاپانی طالبہ نے کیا

کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں کا موسم شمال کی طرف سے اس جنگل تک آگیا تھا جس میں لومڑی اپنے بچے کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک صبح لومڑی کا بچہ جب اپنے بل سے باہر نکل کر آرہا تھا تو اچانک "ہائے" کہہ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ماں کے پاس بھاگ کر واپس آیا۔ اس نے کہا۔ "امی میری آنکھیں میں کوئی چیز چبھ گئی ہے۔ اس کو نکال دیجئے۔ جلدی سے۔" لومڑی گھبرا گئی اور بچے کے ہاتھوں کو اس کی آنکھوں پر سے ہٹا کر خوف زدہ انداز میں دیکھا۔ مگر بچے کی آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا پھر لومڑی نے بل سے باہر جاکر دیکھا اور اس کو وجہ معلوم ہو گئی۔ پچھلی رات برف بہت زیادہ پڑی تھی۔ سفید سفید برف کے اوپر سورج جگمگا رہا تھا۔ برف پر سورج

کی کرنوں کی وجہ سے تیز چمک پیدا ہو رہی تھی۔ لومڑی کے بچے نے برف کبھی نہیں دیکھی تھی اور برف پر کرنوں کے منعکس ہونے سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ وہ سمجھا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی چیز چبھ گئی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد لومڑی کا بچہ کھیلنے نکل گیا۔ وہ ریشم کی طرح نرم برف کے ذرّوں کو پھوہار کی طرح اچھال رہا تھا اور برف کی چھوٹی سے دھنک بن گئی تھی۔ اچانک اس کی پشت پر بھد کی آواز ہوئی اور آٹے کی طرح برف کے ذروں نے اس کو ڈھک لیا۔ حیرت زدہ لومڑی کا بچہ برف پر لڑھکتے ہوئی کافی دور تک چلا گیا۔ "کیا چیز گری؟" یہ سوچتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ مگر کچھ نہ تھا۔ کیونکہ صنوبر کی شاخ سے برف تو پہلے ہی گر چکی تھی۔ ابھی شاخوں کے درمیان سے سفید ریشم کی طرح ہلکی ہلکی برف اڑ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد لومڑی کے بچے نے اپنے بل میں واپس آکر کہا۔ "امی میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو کر ٹھٹھر رہے ہیں۔" لومڑی کے بچے نے اپنے لال لال ہاتھ ماں کو دکھائے۔ لومڑی نے بچے کے ہاتھوں کو اپنی سانس سے گرمی دی اور اپنے گرم ہاتھ سے بچے کے ہاتھوں کو ڈھک کر کہا۔ "ابھی گرمی آجائے گی۔ برف چھونے کے بعد ہاتھ جلدی گرم ہو جاتے ہیں۔" مگر لومڑی نے سوچا کہ اگر میرے پیارے بچے کے ہاتھ سردی سے پھٹ گئے تو اسے بہت تکلیف ہو گی۔ اس لئے میں رات میں شہر جاکر اپنے بچے کے لئے اونی دستانے خریدوں گی۔

آہستہ آہستہ اندھیری رات کی چادر اپنے سایہ سے جنگل اور میدان کو ڈھکنے کے لئے آگئی مگر برف کی سفیدی رات کی سیاہی میں بھی اپنی چمک دکھا رہی تھی۔ لومڑی اپنے بچے کے ساتھ بل سے باہر نکلی۔ بچہ تو اپنی ماں کے پیروں کے درمیان اپنی گول گول آنکھیں کو جھپکاتے اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ پہاڑ سے اترتے ہوئے تھوڑی دور سامنے چند روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آئیں۔ لومڑی کے بچے نے ان کو دیکھ کر کہا۔

"امی! وہاں اتنے نیچے بھی ستارے ہوتے ہیں؟"

"نہیں، وہ ستارے نہیں۔"

یہ کہہ کر لومڑی کے پاؤں خوف سے کانپنے لگے۔

"وہ شہر کی روشنیاں ہیں۔"

لومڑی کے دماغ میں اس واقعے کا خیال آیا جب ایک دن اپنے دوست کے ساتھ شہر تک کھیلنے گئی تھی اور اسے سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا دوست منع کرنے کے باوجود ایک گھر میں بطخ چرانے کے لئے گھسا ہی تھا کہ کسان نے دیکھ لیا اور پیچھے دوڑا تھا۔ وہ دونوں بہت گھبراہٹ میں وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔

"امی! کیا ہوا؟ تیز تیز چلیں۔"

بچے نے پیٹ کے نیچے نیچے چلتے ہوئے کہا مگر لومڑی کے پاؤں رک رہے تھے۔ اس لئے اس نے سوچا کہ بچہ اکیلا شہر تک جائے۔ لومڑی نے کہا۔ "بیٹا، اپنا ہاتھ دکھاؤ۔" اس ہاتھ کو ماں نے کچھ دیر اپنے ہاتھ میں رکھا تو وہ انسانی ہاتھ میں بدل گیا۔ لومڑی کا بچہ اس ہاتھ کو کھولتا، بند کرتا، پکڑتا، چٹکی بھرتا آزمانے لگا۔ "عجیب ہے۔ یہ کیا ہے؟" یہ کہہ کر لومڑی کے بچے نے برف کی روشنی میں اس ہاتھ کو جو انسانی ہاتھ کی طرح بن گیا تھا، دیکھا۔ "یہ انسان کا ہاتھ ہے۔ سنو بیٹا، شہر میں انسان کے گھر زیادہ ہوتے ہیں۔ پہلے وہ گھر تلاش کرو جس کے آگے گول ٹوپی کا نشان بنا ہو۔ اور اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر آداب عرض کہو تو آدمی اندر سے دروازے کو تھوڑا کھولے گا۔ اس دروازے سے یہ ہاتھ۔ یہ انسانی ہاتھ دکھا کر کہنا کہ اس ہاتھ کے لئے دستانہ دیجئے۔ ٹھیک؟ دوسرا ہاتھ مت دکھانا۔"

بچے نے پوچھا "کیوں؟"

"کیونکہ آدمی لومڑی کو دستانے نہیں بیچتے بلکہ وہ لومڑی کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیتے ہیں۔"

"آدمی بہت خطرناک ہوتا ہے؟" "ہاں ..... دوسرا ہاتھ ہرگز مت دکھانا! بس یہی، انسانی ہاتھ دکھانا۔" لومڑی نے یہ کہہ کر دو روپے اس ہاتھ پر رکھ دیئے۔ لومڑی کا بچہ برف کی آب وتاب میں شہر کی روشنیوں کی طرف میدان میں پھسلتے ہوئے چلنے لگا۔ پہلے تھوڑی روشنیاں تھیں مگر بعد میں بہت سی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ لومڑی کے بچے نے ان کو دیکھ کر سوچا کہ روشنیوں میں ستاروں کی طرح سرخ یا پیلی یا نیلی روشنیاں بھی ہوتی ہیں۔ پھر وہ شہر میں داخل ہوا مگر سڑک کے کنارے والے سب گھروں کے دروازے بند تھے اور اوپر کھڑکیوں سے برف پر روشنی پڑ رہی تھی۔ مگر عام طور پر نشان کی تختیوں پر روشنی تھی۔ اس لئے لومڑی کا بچہ انہیں دیکھتے ہوئے ٹوپی کی دکان تلاش کر رہا تھا۔ بائیسکل کی، عینکوں کی، اور دوسری تختیاں زیادہ تھیں۔ ایک تختی بالکل نئی تھی اور ایک تختی کا رنگ پرانی دیوار کی طرح اڑ گیا تھا۔ لومڑی کا بچہ زندگی میں پہلی بار شہر آیا تھا۔ اس لئے یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ تختیاں کیا ہیں؟ آخر کار اس نے ٹوپی کی ایک دکان دیکھی۔ وہ کالا بڑا گول ٹوپی کا نشان جو ماں نے اس کو بتایا تھا، نیلی روشنی میں آویزاں تھا۔ لومڑی کے بچے نے ماں کی ہدایت کے مطابق دروازہ کھٹکھٹا کر کہا۔ "آداب عرض!" تو اندر سے کسی آدمی نے چرچراہٹ کے ساتھ تھوڑا سا دروازہ کھولا اور روشنی کی ایک پٹی سڑک پر دور تک بن گئی۔ وہ روشنی بہت تیز تھی۔ اس لئے لومڑی کے بچے نے گھبراہٹ میں غلطی سے انسانی ہاتھ کے بجائے دوسرا ہاتھ دروازے کی دراز میں ڈال دیا۔ "اس ہاتھ کے لئے دستانے دیجئے۔" ٹوپی والے نے سوچا۔ "ارے! یہ تو

لومڑی کا ہاتھ ہے! لومڑی کا ہاتھ دستانے مانگتا ہے! شاید پتے کے روپے سے خریدے گا۔" اور ٹوپی والے نے کہا۔ "پہلے روپے دیجئے۔" لومڑی کے بچے نے ایک دم روپے ٹوپی والے کو دیئے۔ ٹوپی والے نے ان روپوں کو اپنی انگلیوں سے بجایا تو کھن کھن کی آواز آئی۔ اس لئے ٹوپی والے نے سوچا کہ یہ پتے کے روپے نہیں۔ اصلی روپے ہیں اور الماری سے اونی دستانے نکال کر لومڑی کے بچے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ بچے نے شکریہ ادا کیا اور واپس جانے لگا۔ اس نے سوچا۔ "ماں نے کہا تھا کہ آدمی بہت خطرناک ہوتا ہے مگر کچھ بھی خطرناک نہیں۔ کیونکہ میرا ہاتھ دیکھنے کے باوجود بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔" مگر لومڑی کا بچہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آدمی کیسا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک کھڑکی کے نیچے جاکر گانے کی آواز سننے لگا۔ اتنی خوبصورت، اتنی میٹھی، اتنی مہربان آواز ہے!

"سوجا سوجا میرے لال سوجا اماں کے سینے پہ
اماں کے ہاتھوں پہ۔"

لومڑی کے بچے نے سوچا کہ وہ آدمی کی ماں کے گانے کی آواز ہے! کیونکہ جب مجھے نیند آتی ہے تو میری ماں بھی ایسی ہی مہربان آواز سے مجھے لوری سناتی ہے۔ پھر اس نے بچے کی آواز بھی سنی۔ "امی، کیا اس جاڑے کی رات میں لومڑی کا بچہ سردی سردی کہہ کر روتا ہے؟" تو ماں کی آواز آئی۔ "جنگل میں شاید لومڑی کا بچہ بھی اپنی ماں کی لوری سنتے ہوئے اپنے بل میں سونے والا ہوگا۔ دیکھو تم بھی جلدی سے سوجاؤ۔ دیکھیں تم یا لومڑی کا بچہ، پہلے کون سوتا ہے؟ شاید تم پہلے سو جاؤ گے۔" یہ سن کر لومڑی کا بچہ اپنی ماں کے پاس پہنچنے کے لئے بیتاب ہو گیا اور جلدی جلدی گھر واپس جانے لگا۔

لومڑی کانپتے ہوئے پریشانی کے عالم میں اپنے بچے کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ جیسے ہی بچہ اس کے پاس پہنچا وہ مارے خوشی کے اس کو گلے سے لگا کر رونے لگی۔ دونوں جنگل کی طرف واپس چلے۔ چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے لومڑی کے بال چاندی کے تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے اور برف پر ان پاؤں کے نیلے نشان چمک رہے تھے۔

"امی، آدمی تو بالکل بھی خطرناک نہیں ہوتا۔"

"کیوں؟"

"میں نے غلطی سے اپنا اصلی ہاتھ دکھا دیا تھا مگر دکان والے نے مجھے نہیں پکڑا۔ اور مجھے گرم دستانے دیئے۔" یہ کہہ کر لومڑی کے بچے نے دستانے والے ہاتھوں کو غپ غپ بجایا۔ لومڑی کی ماں نے حیرت سے "ارے" کہہ کر سوچا کہ شاید میں ہی غلطی پر تھی۔ انسان حقیقت میں بہت اچھا ہوتا ہے۔ بہت اچھا۔

ان سے تعاون کیجیے ان پر اعتماد کیجیے

وطن عزیز کے قریے قریے
اور نگر نگر
ہر ماہ باقاعدگی سے
آنکھ مچولی
پہنچانے کے لیے ہم نے
ان اداروں
کو اپنا باقاعدہ
ایجنٹ
مقرر کیا
ہے

ادارہ	شہر	فون
محمد حسین برادرز	کراچی	۷۷۲۴۱۲۶
سلطان نیوز ایجنسی	لاہور	۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد	راولپنڈی	۵۵۴۳۲
مہران نیوز ایجنسی	حیدرآباد	۲۰۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی	پشاور	۶۲۵۱۵
اے ایس حامد نیوز سروس	ملتان	۴۳۳۱۰
فیاض بک ڈپو	فیصل آباد	۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز	کوئٹہ	۷۵۰۰۲
اسلم نیوز ایجنسی	گوجرانوالہ	
سلمان برادرز	نواب شاہ	۲۴۱۴
سعید بک اسٹال	گجرات	۳۶۳۹
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال	سرگودھا	۶۲۹۵۱
طاہر نیوز ایجنسی	جہلم	
کیپٹل نیوز ایجنسی	بہاولپور	۲۹۵۷
چوہدری امانت علی اینڈ سنز	رحیم یار خان	۷۲۹۲۶
مسلم بک ڈپو	سرائے عالمگیر	
رحمت بک اسٹال	اوکاڑہ	
رہبر نیوز ایجنسی	منڈی مدرسہ ضلع بہاول نگر	
ملک اینڈ سنز	سیالکوٹ	۸۷۹۸۹
سلطانی نیوز ایجنسی	چکوال	
مولا بخش نیوز ایجنسی	مہران مرکز سکھر	
خالد بک اسٹال	گجرات	۳۷۳۱
اسلامی نیوز ایجنسی	وہاڑی	۲۸۸۹

آنکھ مچولی
خریدنے کے لیے

ان ناموں پر اعتماد کیجیے

اپنی تجاویز اور مشوروں کیلئے

خط وکتابت کے لیے

ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

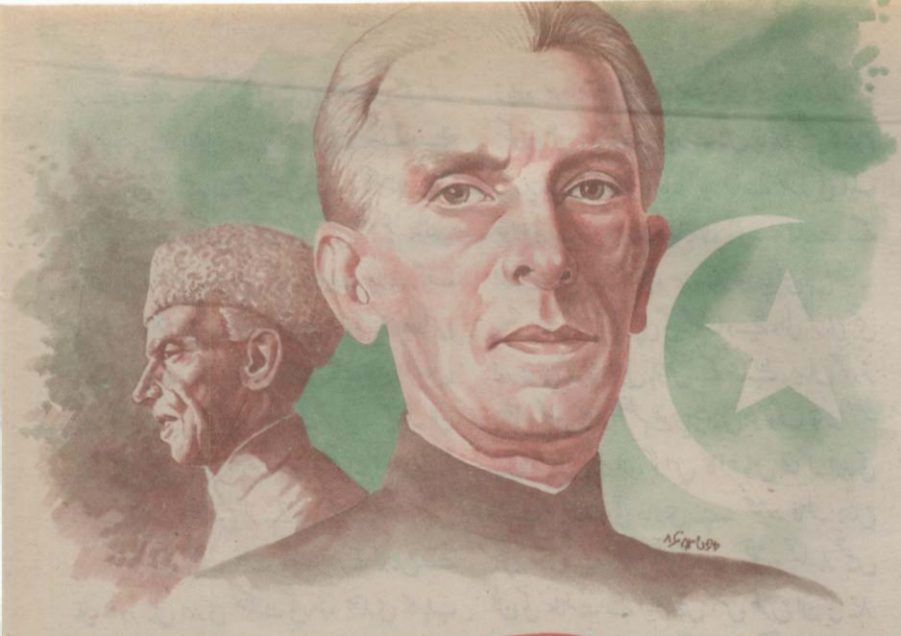

جب قوم یتیم ہو گئی

نثار احمد ھاشمی

قدرت نے قائداعظم کو عزم و حوصلے کی زبردست قوت عطا کی تھی۔ پاکستان قائم ہونے کے بعد وہ مسلسل محنت کرنے کی وجہ سے تھک گئے تھے اور ان کی صحت مزید مصروفیات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ انہیں آرام کی سخت ضرورت تھی۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود انہوں نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی صحت کی پروا نہ کی اور زندگی کی تمام تر توانائیاں اپنے وطن کے لئے وقف کر دیں۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں قرار داد پاکستان منظور ہونے کے بعد ہی سے ان کی صحت رفتہ رفتہ جواب دینے لگی تھی۔ خرابیٔ صحت کے باوجود انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مطالبۂ پاکستان کو تاریخِ انسانی کا ایک روشن باب بنا کر ہی دم لیں گے۔ ۱۹۴۱ء میں قائداعظم کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اور غالباً یہ اس بیماری کا آغاز تھا جس نے قائداعظم کو آخر کار ملک و قوم سے چھین لیا۔ موسم اور اپنی صحت کی پروا کئے بغیر وہ برِ صغیر کے مختلف علاقوں کے دورے

کرتے رہتے۔ ان دوروں میں وہ جلسوں میں اور نجی طور پر ملنے والوں کو ذرا احساس نہ ہونے دیتے تھے کہ ان کی صحت اچھی نہیں ہے۔ پاکستان بنا تو ان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو انہیں کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرنا تھا۔ اگرچہ ان کی صحت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے تقریب میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ بڑی اہم تقریب تھی۔ انہوں نے اسٹیٹ بینک کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا:

"اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح سے مالی امور میں ہماری مملکت کی خود مختاری کا باب شروع ہوتا ہے۔"

قائداعظم کی سرکاری مصروفیات میں انہیں آرام کا موقع نہیں مل پاتا تھا۔ وہ ایک نئے ملک کو بنانے میں دن رات مصروف رہتے تھے۔ اس سے ان کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی۔ چنانچہ وہ کراچی سے کوئٹہ تشریف لے گئے لیکن کوئٹہ میں بھی چین سے نہ بیٹھے۔ مختلف اداروں کی طرف سے دعوت نامے چلے آرہے تھے اور بہت سے افراد اور رہنما ان سے ملاقات کے خواہاں تھے۔ ان کو اس بات کا دُکھ تھا کہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے لوگوں کو مایوس ہونا پڑتا ہے۔ قائداعظم کی علالت سنگین صورت اختیار کر گئی تھی اور ان کے معالج پریشان تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قائداعظم کو کوئٹہ سے چند میل دور "زیارت" منتقل کر دیا جائے جو نسبتاً زیادہ سرد مقام تھا اور جہاں ان کو زیادہ آرام و سکون مل سکتا تھا۔ زیارت میں قائداعظم کا قیام "ریزیڈنسی" میں تھا۔ یہ پرانے طرز کی ایک خوبصورت دو منزلہ عمارت تھی۔ عمارت کے احاطے میں ایک کشادہ سبزہ زار اور پائیں باغ تھا۔

یہاں نہ تو کراچی کی جھلسا دینے والی گرمی تھی اور نہ ہی گورنر جنرل ہاؤس کے ضابطے، یہاں گورنر جنرل محض قائداعظم تھے زیارت میں جو لوگ قائداعظم سے قریب تھے ان کو اس کا احساس تھا کہ ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح جو برسوں سے قائداعظم کی واحد رفیق و غمگسار تھیں ان کی علالت کے ایّام میں جس طرح ان کی تیمار داری اور خدمت کر رہی تھی وہ ایک عظیم بہن ہی کا حصہ تھا۔

قائداعظم کی علالت زیادہ تشویش ناک ہوئی تو ممتاز معالج کرنل الٰہی بخش کو جولائی کے آخر میں زیارت طلب کیا گیا۔ جسمانی کمزوری کے باوجود قائداعظم چاق و چوبند تھے۔ ان کی طبیعت کی جولانی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کرنل الٰہی بخش نے اپنے مریض کا معائنہ کیا جس کی صحت و زندگی انتہائی قیمتی تھی۔ تفصیلی معائنہ سے معلوم ہوا کہ قائداعظم کے پھیپھڑوں پر ورم ہے اور وہ تقریباً دو سال سے اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹروں کے سخت اصرار پر آخر کار ان کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی فی الحال ملتوی کر دیں گے۔ چند روز بعد

ڈاکٹروں نے طے کیا کہ اس حالت میں زیارت کی آب و ہوا قائداعظم کے لئے نامناسب ہے۔ قائداعظم نے ڈاکٹروں کی تجویز سے اتفاق تو کیا تاہم خواہش ظاہر کی کہ ۱۴ اگست کے بعد ان کو کوئٹہ پہنچا دیا جائے۔ قائداعظم ۱۳ اگست کو زیارت سے کوئٹہ روانہ ہو گئے۔ کوئٹہ میں ان کی طبیعت سنبھلنے لگی لیکن ستمبر کے اوائل سے کوئٹہ کی آب و ہوا سے ان کی صحت پر مضر اثر پڑ رہا تھا۔ ان کو سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور اکثر آکسیجن دینی پڑتی تھی۔ جو لوگ ان کے قریب تھے وہ مایوس ہوتے جا رہے تھے اور دن رات قائداعظم کی صحت یابی کی دعا کرتے۔

ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اب یہ طے پایا کہ کوئٹہ سے قائداعظم کو کراچی منتقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ ۱۱ ستمبر کو دن کے ۲ بجے جہاز کراچی روانہ ہو جائے گا جس وقت قائداعظم کو اسٹریچر پر جہاز میں لے جایا جا رہا تھا تو عملے نے صف آرا ہو کر ان کو سلامی دی۔ انہوں نے بمشکل ہاتھ کے اشارے سے سلامی لی۔ تقریباً ۲ گھنٹہ کی پرواز کے بعد سوا چار بجے سہ پہر کے وقت گورنر جنرل کا "وائکنگ" ماری پور پر اترا۔ ہدایات کے مطابق ان کے ملٹری سیکرٹری کے سوا کوئی اور شخص ایئرپورٹ پر موجود نہ تھا۔

قائداعظم کو اسٹریچر پر لٹا کر ایک فوجی ایمبولینس میں لے جایا گیا۔ تقریباً ۴ میل ہی کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ گاڑی کے انجن میں خرابی ہو گئی اور گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی مگر انجن کسی طرح اسٹارٹ نہ ہو سکا۔ اب کیا کیا جائے؟ اس روز ہوا بھی بند تھی اور گرمی ناقابل برداشت تھی۔ ڈاکٹروں کو دوسری ایمبولینس کا انتظار تھا اور ہر لمحہ اضطراب میں گزر رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد دوسری ایمبولینس آئی اور اس طرح یہ قافلہ چھ بجے شام کے بعد گورنر جنرل ہاؤس پہنچا۔

رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے قائداعظم نے شدید تکلیف کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر کمرے میں موجود تھے، انہوں نے معائنہ کیا۔ نو بجکر پچاس منٹ پر ڈاکٹر الٰہی بخش نے جھک کر سرگوشی میں کہا کہ جناب عالی! ہم نے آپ کو طاقت کا انجکشن لگا دیا ہے۔ قائداعظم نے اپنے سر کو جنبش دی اور کمزور آواز میں کہا کہ :۔ "نہیں میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔" یہ ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا آخری کلمہ تھا۔ چند منٹ بعد جب کہ وہ محوِ خواب تھے تو انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۝

ان کے انتقال کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی گورنر جنرل ہاؤس کے آہنی دروازے کھول دیئے گئے۔ جوان، بوڑھے، عورتیں مرد ہزاروں کی تعداد میں چلے آ رہے تھے، ہر آنکھ اشکبار تھی اور وہ ملک جس کی عمر صرف ایک سال تھی یتیم ہو گیا تھا۔

حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

ایاز محمود

س: یہ دیکھا گیا ہے کہ خطرے کی علامت کے طور پر سرخ رنگ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ مثلاً ٹریفک لائٹ اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں جو ہمیشہ سرخ رنگ کی ہوتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

حبیب احمد قدوائی شمالی ناظم آباد، کراچی۔

○ ..... آپ نے اچھا سوال پوچھا ہے۔ سرخ رنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی موجیں بہت کم بکھرتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سرخ رنگ میں انتشار سب سے کم ہوتا ہے لہٰذا یہ ہمیں دور ہی سے نظر آجاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بھی سرخ رنگ دیکھ کر ہمارے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خون کا رنگ سرخ ہوتا ہے اور اس کے حوالے سے کسی حادثہ وغیرہ کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرخ رنگ کو خطرے کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

س: ہوائی جہاز کیسے اڑتا ہے؟ براہ مہربانی ہیلی کاپٹر کے بارے میں بھی معلومات فراہم کیجئے۔

شیخ اعتبار علی، فیصل آباد۔

○ ..... پہلے جہاز کے اصول کو سمجھ لیجئے۔ انسان ابتدا ہی سے پرندوں اور ان کی اڑان کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ ایک برطانوی سائنس دان سر جارج کیسلے نے چڑیوں کی اڑان کو دیکھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر کسی چپٹی شے کو تھوڑا سا ترچھا کر کے ہوا میں ایک خاص زاویئے سے آگے کی طرف پھینکا جائے تو وہ خاصی دیر تک ہوا میں معلق رہ سکتی ہے۔ یہ بات ممکن اس طرح سے ہوتی ہے کہ ہوا میں چپٹے جسم کی اوپری سطح پر سے گزرنے سے جزوی خلا پیدا ہوتا ہے جو کہ اس جسم کو سنبھالے رکھتا ہے۔ جب تک یہ جسم حرکت کرتا رہے گا جزوی خلا پیدا ہوتا رہے گا اور اس طرح وہ جسم گرنے نہیں پائے گا۔ یہ دریافت آج سے تقریباً دو صدی پہلے کی ہے۔ اب ایسے ہی کسی جسم کو ایک انجن کی مدد سے آگے بڑھایا جائے تو وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ہوا میں پرواز کر سکے۔ اس کے لئے ایک مخصوص بناوٹ شرط ہے جو اس جسم کو ہوا میں توازن کے ساتھ سنبھال سکے۔

ہیلی کاپٹر کا سلسلہ یہ ہے کہ اسے ہوائی جہاز کی طرح دوڑنا بھاگنا نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ جہاں کھڑا ہوا ہو وہیں سے عموداً ہوا میں بلند ہو جاتا ہے۔

ہیلی کاپٹر کی ایجاد کا سہرا فرانس کے رہنے والے سائنس دان لوئی برے گوئے کے سر ہے جس نے ۱۹۰۷ء میں جائرو پلین نامی مشین ایجاد کی یہی پہلا ہیلی کاپٹر تھا۔ آپ نے ہیلی کاپٹر اس کی تصویر یا کھلونا ہیلی کاپٹر تو دیکھا ہو گا۔ اس کے اوپر بڑے بڑے پنکھ لگے ہوتے ہیں۔ جب ان کو گھمایا جاتا ہے تو یہ بڑے زور سے چلتے ہیں اور نتیجتاً اوپر کا دباؤ کم اور نیچے کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو جاتا ہے۔ پنکھوں کی رفتار کو کم یا زیادہ کر کے اسے ہوا میں معلق بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ بہت کام کی چیز ہے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر زخمی یا ڈوبتے ہوئے انسانوں کو بچانے میں اس کا بہت مفید استعمال ہے۔

س: آواز کی لہریں کس طرح گردش کرتی ہیں اور کان کے پردوں سے کس طرح ٹکراتی ہیں؟

خالدہ جبیں۔ سعید آباد

کسی شے میں ارتعاش یا تھرتھراہٹ آواز پیدا کرتی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ فضا میں لہریں بناتی ہوئی ہمارے کان کے پردے سے ٹکراتی ہے اور ہم اس آواز کو سن لیتے ہیں۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہر آواز کی ایک خاص فریکونسی ہوتی ہے۔ انسانی کان چند مخصوص فریکونسی کو ہی سن سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جنہیں ہم سن نہیں سکتے لیکن بعض جانور ان کو بآسانی سن لیتے ہیں۔ آواز خلا میں سفر نہیں کر سکتی۔ اس کے لئے کسی مادی شے یا موصل کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی ایسا کمرہ بنایا جائے جہاں بالکل ہوا نہ

ہو تو ہم وہاں کسی قسم کی آواز نہیں سن سکیں گے۔ آواز کی لہریں فضا میں ایک مخصوص رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ روشنی کی رفتار کے مقابلے میں آواز کی رفتار کچھ بھی نہیں۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا فاصلہ طے کرتی ہے اس کے برخلاف آواز کی رفتار فقط گیارہ سو فٹ فی سیکنڈ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور بیٹھا ہوا آدمی ہمیں ہتھوڑے سے ضرب اس طرح لگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ ضرب لگتی ہوئی نظر آتی ہے اور ایک قلیل وقفے کے بعد ضرب سے پیدا ہونے والی آواز سنائی دیتی ہے۔ بادل کی گرج اور بجلی کے جھماکے کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ پہلے ہمیں بجلی چمکتی ہوئی نظر آتی ہے اور بعد میں گرج سنائی دیتی ہے۔

س: کیا وجہ ہے کہ اگر جسم کے کسی حصے پر تیزاب گر جائے تو وہ حصہ بری طرح جل جاتا ہے؟

قدسیہ اکبر، بہاول نگر۔

ج۔ تیزاب کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ نسبتاً کمزور تیزاب جنہیں ہم کھانے پینے میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً سرکہ اور نیبو کا رس، اور طاقت ور تیزاب جیسے گندھک کا تیزاب، اور شورے کا تیزاب وغیرہ۔ تیزاب انگریزی کے لفظ ایسڈ کا ترجمہ ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ ہم انہیں ترشہ کہیں۔ وجہ یہی ہے کہ تمام ایسڈ ترش تو لازماً ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ تیز اور جلا دینے والے بھی ہوں اور تیزاب تو آپ جانتے ہی ہیں،

○ ..... انسانی جسم پر تقریباً ۵ لاکھ بال ہوتے ہیں۔

○ ..... مچھر کے تقریباً ۲۳ دانت ہوتے ہیں۔

○ ..... گلاب کی ۹۴۷ اقسام ہیں۔

○ ..... کٹل فش کے کل تین دل ہوتے ہیں۔

○ ..... اصلی ہیرے کو چاٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ۔ محمد رومان بیگ، فیصل آباد)

تیز اور آب کا مرکب ہے۔ یعنی تیز پانی۔

اب آیئے اپنے سوال کی طرف۔ بعض تیزاب واقعی بہت خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں اور ان کے استعمال میں ذرا سی بے احتیاطی ایک بڑے حادثہ کو جنم دے سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ ان تیزابوں میں پانی جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس عمل میں وہ حرارت کا اخراج کرتے ہیں۔ اب چونکہ تمام حیاتی سالموں کا لازمی جز پانی ہوتا ہے نتیجے میں تیزاب گرنے کی صورت میں شدید رد عمل ہوتا ہے اور جسم کا متاثر ہونے والا حصہ بُری طرح سے جل جاتا ہے۔

طاقت ور تیزابوں کو استعمال کرنے والے مخصوص قسم کے کپڑے پہنتے ہیں تاکہ کسی حادثہ کی صورت میں حتی الامکان بچاؤ ہو سکے۔ اگر خدانہ خواستہ کوئی شخص تیزاب سے جل جائے تو فوری طور پر متاثرہ جگہ کو پانی سے دھو دینا چاہیے۔ اس کے بعد کسی امونیا محلول سے متاثرہ حصہ کو دھونا بہتر ہے۔

Colorscan
ORIENT

ہو خیالی محبت سے جو آدمی
بہت اُس سے بہتر ہے ایسی ڈمی

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو چچا جان نے کہا کہ آؤ تمہیں گاؤں کی سیر کراتے ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ہم فوراً تیار ہو گئے۔ یہ گاؤں رحیم یار خاں سے کچھ فاصلے پر تھا جہاں ہمارے چچا جان کے ایک بہت پرانے دوست رہتے تھے۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ چچا جان کے دوست کا گھر پکی سڑک سے ہٹ کر کہیں واقع تھا۔ تانگے سے اتر کر ہم پگڈنڈی پر چل پڑے۔ دونوں طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ ابھی ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ میں نے ایک ہیبت ناک منظر دیکھا۔ اندھیرا تو چاروں طرف پھیلا ہی ہوا تھا میں نے دیکھا کہ کھیت میں فصل کے اوپر کوئی آدمی دونوں ہاتھ پھیلائے ہوا میں معلق ہے۔ بے ساختہ میرے منہ سے زور دار چیخ نکلی اور میں چچا جان سے لپٹ گیا۔ چچا جان بوکھلا گئے۔ اور پھر جب میں نے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے انہیں دکھایا تو وہ ہنس پڑے۔ بولے "بیوقوف یہ تو بجوکا ہے!" میں نے کہا۔ "بجوکا! یہ کیا ہوتا ہے؟"

کہنے لگے: "جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو پرندے اسے خراب کر دیتے ہیں۔ ان پرندوں کو ڈرانے اور بھگانے کے لئے نقلی آدمی تیار کر کے فصلوں کے اوپر بانس کی مدد سے لٹکا دیتے ہیں تاکہ پرندے قریب نہ آئیں۔

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ اگلی صبح میں نے بجوکا کو قریب سے دیکھا تو بڑی شرمندگی ہوئی کیونکہ بجوکا دو لمبی لکڑیوں کو کراس کی شکل میں جوڑ کر تیار کیا گیا تھا۔ سر کی جگہ ہانڈی رکھ دی گئی تھی اور اسے لباس پہنا دیا گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر واقعی کسی آدمی کا دھوکا ہو رہا تھا..... یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اکثر گاؤں اور دیہاتوں میں اسی طرح بجوکا تیار کئے جاتے ہیں جو فصلوں کی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں۔ بلکہ یورپ اور امریکا کے کسان بھی ایسے ہی بجوکا کی مدد سے پرندوں سے فصلوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ رنگین تصویریں جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ ایک امریکی خاتون مسز ڈارلنگ کی تیار کردہ ہیں۔ وہ اٹھارہ سال سے نقلی آدمی بنا رہی ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کے چہرے بنائے ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے..... ان چہروں پہ زندہ انسانوں کی طرح تاثرات بھی ہیں..... آپ کوشش کریں تو آپ بھی ایسے ہی آدمی بنا سکتے ہیں..... یہ آپ کے گھر کی حفاظت کے کام آئیں گے۔

ڈاکوؤں اور چوروں کی بہتات بھی تو ہو گئی ہے ناں!!

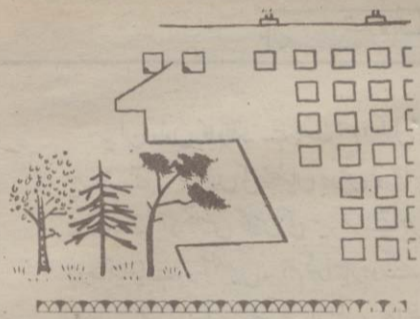

ایک چھوٹے بچّے کو ہفتے کے دنوں کے نام یاد ہی نہ ہوتے تھے۔ ماسٹر صاحب کو ایک ترکیب سوجھی۔ انہوں نے بچّے سے پوچھا۔ "مُنّے میاں! آپ کے گھر میں کچھ جانور وغیرہ ہیں؟"

"جی ہاں! مرغی کے سات بچّے ہیں۔" جواب ملا۔

ماسٹر صاحب یہ سُن کر بے حد خوش ہوئے کہ اب منّے میاں کو ہفتے کے سات دنوں کے نام آرام سے یاد ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا "سُنو! ہفتے کے سات دنوں کے نام ان مرغی کے بچّوں کے ناموں پر رکھ لو اور پھر مجھے سُنانا۔"

تین چار دن بعد ماسٹر صاحب نے بچّے سے پوچھا۔ "نام یاد ہو گئے؟"

بچّے نے خوشی سے کہا۔ "جی ہاں ماسٹر صاحب!"

"تو پھر سناؤ"۔ ماسٹر صاحب نے کہا تو بچّہ شروع ہو گیا۔

"پیر، منگل، جمعرات، جمعہ، ہفتہ اور اتوار۔"

"اور یہ "بدھ" کدھر گیا؟" ماسٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

"بدھ"! بچّے نے معصومیت سے جواب دیا۔ "ماسٹر صاحب! اسے تو بلی کھا گئی۔"

مرسلہ :- مولا بخش، اورنگی ٹاؤن (کراچی)

...... ○ ...... ○ ......

ایک صاحب اپنے کسی دوست کو جنہیں بلدیہ کا دفتر نہیں معلوم تھا، پتہ سمجھا رہے تھے لیکن دوست کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر انہوں نے آسان طریقہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"سنو! گورنمنٹ کی کسی بھی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ بلدیہ کا دفتر جانے والی سڑک پر جا بجا گڑھے ہیں۔ ہر گڑھے میں گاڑی اُچھلتی ہے۔ جہاں جہاں گاڑی اچھلے تم گنتے جاؤ۔ پچیسواں دھکا بہت زور سے لگے گا جس سے پوری بس اُچھل پڑے گی۔ بس وہیں اُتر جانا، سامنے ہی بلدیہ کی عمارت ہے۔"

مرسلہ: محمد فہد شجراہ، جیکب آباد۔

...... ○ ...... ○ ......

اسمبلی کے ایک امیدوار نے ووٹروں کے ایک مجمع میں طویل تقریر کرنے کے بعد کہا "میں آپ کے لئے سب کچھ کروں گا لیکن خدا کے فضل و کرم سے اپنا ضمیر نہیں بیچوں گا۔"

ایک جانب سے آواز آئی۔ "چیز وہی بیچی جاتی ہے جو موجود ہو۔"

مرسلہ: سید محمد اُسامہ، راولپنڈی۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک صاحب نے ایک عمارت میں کرائے پر فلیٹ حاصل کیا۔ کچھ دن بعد ایک لمبا تڑنگا آدمی ان کے پاس آیا اور کہا "نئے پڑوسی ہونے کی حیثیت سے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن آپ ذرا خراٹے آہستہ لیا کریں کیوں کہ میری آنکھ کُھل جاتی ہے۔"

"آپ کی تعریف؟" صاحب نے پوچھا۔

"میری تعریف!" جواب ملا۔ "جناب! میں اس عمارت کا چوکیدار ہوں۔"

مرسلہ: صوفیہ رحمان، تخت بھائی۔

..... ○ ..... ○ .....

استاد نے طلب علموں کو ابتدائی طبّی امداد پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا پھر کہنے لگا "فرض کرو میں مدرسے سے نکلوں، کوئی شخص کھڑا ہو، وہ چُپکے سے مجھے مکّا مار کر گرا دے یا میرا سر کسی چیز سے ٹکرا دے اور میں وہیں زمین پر گر کر بے ہوش ہو جاؤں تو تم لوگ کیا کرو گے؟"

استاد کی یہ بات سن کر کچھ دیر تک جماعت میں خاموشی چھائی رہی پھر اچانک جماعت کے آخری کونے سے کسی شریر لڑکے کی آواز آئی۔

"جناب! چھٹی کریں گے۔"

مرسلہ:۔ نائلہ نبی وانی، بلتستان۔

..... ○ ..... ○ .....

بچّہ (دکان دار سے) "وہ سامنے والی پنسل کتنے کی ہے؟"

دکان دار۔ "کون سی؟"

بچّہ۔ "وہ چار آنے والی"۔

مرسلہ: احمد علی رحمانی شیخوپورہ۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک مرتبہ ایک شخص نے کسی شاعر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مادھوپور کی سڑک کے بارے میں کوئی شعر ارشاد کریں۔

شاعر نے کہا

"یہ سڑک بے دھڑک .....
جاتی ہے مادی پور تک"

اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔ "پہلا مصرع اتنا چھوٹا اور دوسرا اتنا بڑا۔"

شاعر نے کہا۔ "سڑک کو بھی تو دیکھو۔"

مرسلہ:۔سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔

..... ○ ..... ○

استاد "تم جغرافیہ یاد کر کے آئے ہو؟"

شاگرد۔ "نہیں جناب!"

استاد۔ (غصے سے) "کیوں؟"

شاگرد۔ "جناب! کل ہی سیاسی جلسے میں ایک رہنما کہہ رہے تھے کہ ہم جلد ہی دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیں گے۔"

مرسلہ:۔فیصل احمد شجراہ، کندھ کوٹ۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک صاحب کی کار چوری ہو گئی۔ انہوں نے تھانے میں رپٹ درج کرائی۔ لیکن دوسرے دن تھانیدار سے آکر کہنے لگے "تھانے دار صاحب! میری کار مل گئی ہے اسے میرا چھوٹا بھائی لے کر گیا تھا"۔

"لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا....." تھانیدار نے کہا۔ "کیوں کہ مجرم گرفتار ہو چکا ہے۔"

مرسلہ:سید محمد طلحہ، راولپنڈی۔

..... ○ ..... ○

ایک عرب نے کوئی سستا سا گھوڑا خریدا۔ گھوڑا خرید کر وہ جانے لگا تو اس نے تاجر سے پوچھا۔ "بھائی سچ سچ بتاؤ اس میں کوئی عیب تو نہیں؟"

"عیب"! تاجر نے کہا "بخدا اس میں کوئی عیب نہیں صرف ایک پاؤں میں کھجور کے برابر زخم ہے، پیٹھ میں انگور کے برابر گٹھلی ہے، پیٹ میں نارنگی کے برابر پھوڑا ہے اور پچھلی ٹانگوں میں گول امرود کے برابر معمولی سا گھاؤ ہے۔" عرب جھلا کر بولا "تو گھوڑے بیچتا ہے یا پھل؟"

مرسلہ:عبدالحفیظ پیرزادہ، پنجگور۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک مرغی خانے کے مالک کو صاف ستھرے اور دیانت دار ملازم کی ضرورت تھی۔ ایک امیدوار آیا۔ مالک نے اس نے پوچھا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم انڈے چوری نہیں کرو گے؟" جواب ملا "جناب! آپ اس بات سے اندازہ لگائیں کہ میں نے ایک حمام میں تین سال تک ملازمت کی اور ایک مرتبہ بھی نہیں نہایا۔"

مرسلہ:سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک امیر آدمی جو اپنی امارت کے نشے میں چور تھا بیمار ہو گیا اور اسے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ ڈاکٹر کو سادہ لباس میں دیکھتے ہی اس کا احساسِ برتری کا جذبہ جاگ اٹھا۔ اس نے پہلے تو اپنے قیمتی سوٹ کو دیکھا پھر حقارت سے ڈاکٹر کو دیکھ کر بولا۔

"کیا آپ نے کسی گدھے کا علاج کیا ہے؟"

ڈاکٹر متانت سے مسکرایا اور کہا "جی نہیں! آج پہلا اتفاق ہے۔"

مرسلہ: کامران بنارس، آزاد کشمیر۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک بچہ پہلے دن اسکول گیا۔ چھٹی کے بعد گھر واپس آیا تو ماں نے خوشی سے پوچھا۔

"پڑھ آئے بیٹا!؟"

"نہیں امی! کل پھر جانا پڑے گا۔" بچے نے افسردگی سے جواب دیا۔

مرسلہ:- جنید رؤف، بلدیہ ٹاؤن (کراچی)

..... ○ ..... ○ .....

نرسری جماعت کی ایک بچی چھٹی ہونے کے بعد جب گھر جانے لگی تو مس سے بولی۔ "مس! مجھے جوتے پہنا دیں۔"

مس نے جھک کر اسے جوتے پہنا دیئے تو بچی بولی۔

"مس! آپ کو پتہ ہے یہ میرے جوتے نہیں ہیں !!"

"افوہ! پہلے کیوں نہیں بتایا۔" مس نے بچی کے پیروں سے جوتے اُتار دیئے تو بچی معصومیت سے بولی۔

"مس! یہ جوتے میری بڑی بہن کے ہیں لیکن امی نے آج یہی پہنا کر اسکول بھیجا تھا۔ پلیز! آپ

دوبارہ پہنا دیں۔"

مرسلہ:- صدف مظفر، راولپنڈی۔

..... ○ ..... ○ .....

ایک ڈاکٹر کے مطب میں مریضوں کی تعداد اچانک گھٹنے لگی تو اس نے اپنے دوسرے ڈاکٹر دوست سے اس بات کا ذکر کیا۔ دوست نے کہا۔

"میں کل تمہارے مطب میں آکر صورتِ حال کا جائزہ لوں گا پھر کوئی مشورہ دے سکوں گا۔"

دوسرے دن دوست، ڈاکٹر کے مطب پر آیا اور ایک گھنٹے بعد جب واپس جانے لگا تو ڈاکٹر سے آہستہ سے بولا۔

"مریض کو نسخہ دیتے وقت "دو گز کفن کا ٹکڑا ترا لباس ہو گا" والا گانا مت گنگنایا کرو۔"

مرسلہ: راشد عبدالرفیق، کراچی۔

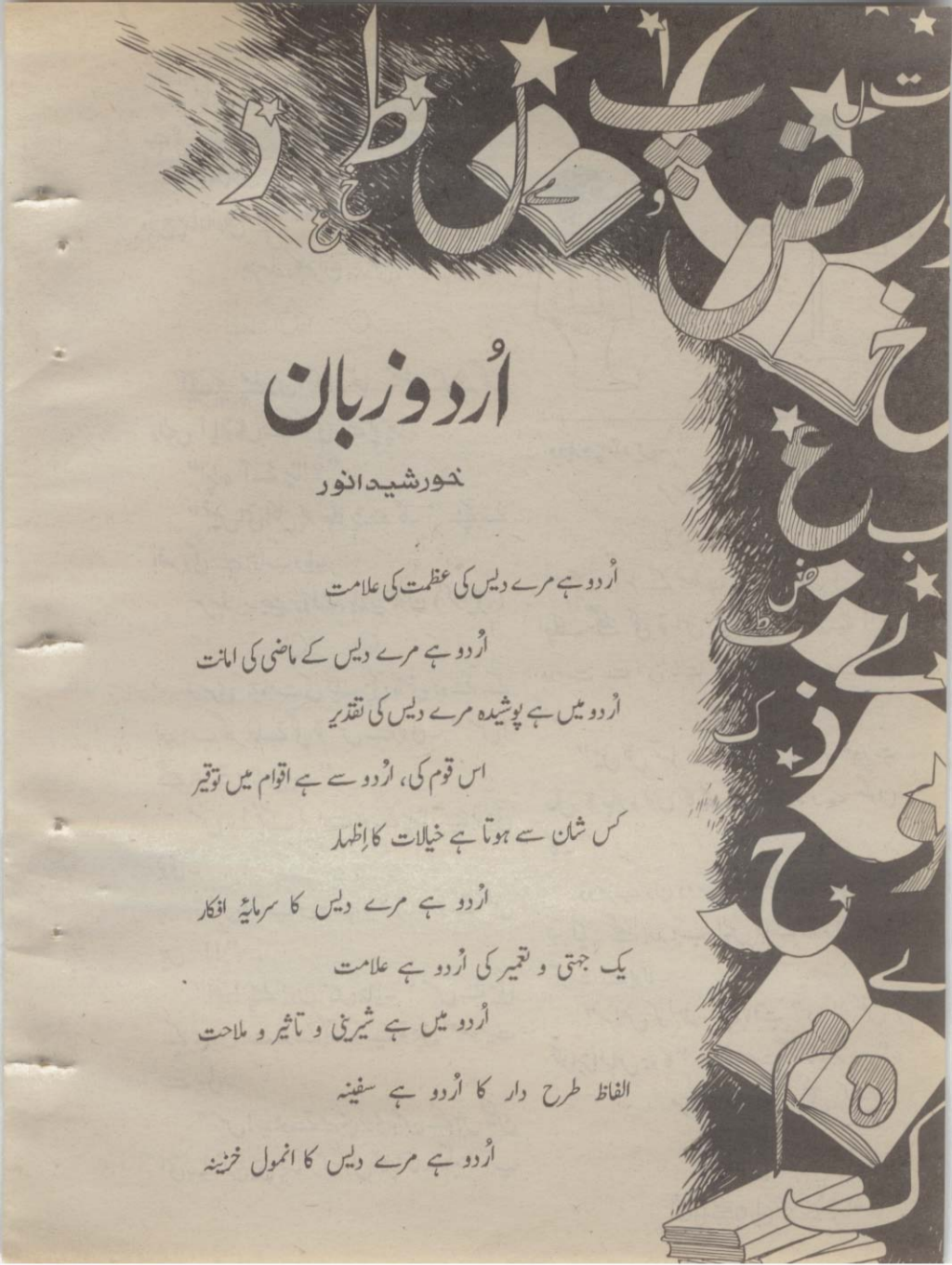

اُردو زبان

خورشید انور

اُردو ہے مرے دیس کی عظمت کی علامت

اُردو ہے مرے دیس کے ماضی کی امانت

اُردو میں ہے پوشیدہ مرے دیس کی تقدیر

اس قوم کی، اُردو سے ہے اقوام میں توقیر

کس شان سے ہوتا ہے خیالات کا اظہار

اُردو ہے مرے دیس کا سرمایۂ افکار

یک جہتی و تعمیر کی اُردو ہے علامت

اُردو میں ہے شیرینی و تاثیر و ملاحت

الفاظ طرح دار کا اُردو ہے سفینہ

اُردو ہے مرے دیس کا انمول خزینہ

تایا کے طمانچے

سلمان محسن

یہ ان دنوں کی بات ہے جب راوی چین ہی چین لکھتا تھا اور ہمیں کھیلنے کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ کھیل کر تھک جاتے تو سو رہتے اور سو کر اٹھتے تو پھر کھیل میں لگ جاتے۔ ایک دن جب کھیل سے فارغ ہوئے تو پہلی مرتبہ ہمیں گھر کی فضا میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ وہ تبدیلی جو اکثر عید، شب برات یا دیگر خوشی کے تہواروں پر نظر آتی ہے۔ گھر میں خوب چہل پہل لگی تھی۔ بڑے کمرے سے باتوں کی آواز سن کر ہم بے دھڑک دروازے کی طرف لپکے۔ اندر ابا میاں کے ساتھ سفید پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس ایک شخص براجمان تھا۔ لہٰذا ہم نے الٹے پاؤں واپس آنے میں ہی عافیت جانی اور واپس آکر ان صاحب کے متعلق سوچنے لگے۔ "آخر یہ ہیں کون جو سب لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں اور ان کی خوب خاطر تواضع بھی ہو رہی ہے..... ابا میاں کے کوئی جاننے والے ہوں گے، شاید ڈاکٹر صاحب ہیں۔" لمبی شیروانی اور سفید پاجامے کی بنا پر ہم نے اندازہ لگایا۔ مگر گھر میں تو سب بھلے چنگے ہیں۔ ابھی ہم کسی نتیجہ پر پہنچنے ہی والے تھے کہ ابا میاں

مرے سے وارد ہوئے اور ہمارا ہاتھ پکڑ کر ان صاحب کے پاس لے گئے۔ ہمیں ان کے سامنے کھڑا کر کے کہنے لگے "یہ ہمارے چھوٹے فرزند ہیں۔" یہ سن کر ہم نے اس مجرم کی طرح سر جھکا دیا جو عین جرم کرتے وقت موقع پر گرفتار ہوا ہو۔ دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ زیر لب بسم اللہ کا ورد کرنے لگے (آیت الکرسی ہمیں اس وقت آتی نہ تھی) ڈر ہمیں اس بات کا تھا کہ کہیں ہمارے میلے ہاتھوں سے ان کے کپڑے میلے ہوگئے تو پھر ابا میاں تو کچھ نہیں کہیں گے البتہ اماں بی بعد میں ضرور ہماری خبر لیں گی۔

لیکن اچانک خوشبو کا ایک جھونکا محسوس ہوا اور انہوں نے ہمیں اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ نہ تو انہیں ہمارے میلے کپڑوں سے گھن آئی نہ مٹی بھرے ہاتھوں سے، بلکہ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں ہمارے چہرے کو بھر کر پیار کیا۔ "یہ تو بہت اچھے ہیں۔" ہمارے ننھے ذہن نے رائے قائم کی۔ ابھی ہمارا چہرہ ان کے ہاتھوں میں ہی تھا دل میں تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے کہ "چٹاخ" کی آواز ہمارے کانوں میں گونجی جیسے کارنس سے گر کر پیالہ ٹوٹتا ہے۔ لیکن اصل میں انہوں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر ہمارے نرم گال پر چپت رسید کی تھی۔

شاید ان کی لغت میں اسے چپت ہی کہتے ہوں مگر ہمارے لئے تو یہ بھرپور طمانچے سے کم نہ تھی اور پھر ہم جو ان کے پہلو سے نکل کر بھاگے سیدھے اماں بی کی گود میں۔ ہمارے بھائی کی اس اداکارانہ صلاحیت کو دیکھ کر سب لوگ قہقہے لگانے لگے اور ادھر سسکیاں لینے اور رونے کے جو عالمی ریکارڈ ہم نے توڑے، راگ ملہاری و درباری سب گا ڈالے۔ خیر یہ تو معمولی بات تھی، رونے دھونے کے مقابلے تو ہم بہن بھائیوں میں اکثر منعقد ہوتے رہتے تھے۔ سو یہ مقابلہ بھی بغیر فیصلہ ہوئے ختم ہو گیا اور کچھ وقت کے بعد مہمان، جن کے متعلق ہمیں بعد میں علم ہوا کہ ہمارے تایا جانی ہیں، ہمارے گالوں پر طمانچے کے انمٹ نقوش چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

جہاں تک یاد پڑتا ہے تو تایا جانی کا دوسرا طمانچہ پانچ سال بعد ہمیں اس وقت پڑا جب ہم کھیلنے کے ساتھ ساتھ اچھے خاصے پڑھ بھی چکے تھے۔ یعنی چار جماعتیں پڑھ کر خود کو تعلیم یافتہ سمجھنے لگے تھے۔ ہوا یوں کہ دروازے پر دستک کی آواز سن کر جب ہم باہر معلوم کرنے گئے کہ کون ہے تو ہمارا سامنا ایک اجنبی شخص سے ہوا۔ محسوس یہ ہوا جیسے پہلے کبھی دیکھا ہو۔ سلام کرنے کے بعد ہم نے پوچھا "جی؟ کس سے ملنا ہے؟" جواب کے بجائے اچانک ان کا ہاتھ بلند ہوا اور خلاف توقع "چٹاخ" کی رسیلی آواز آئی جس سے ہمارا دائیں گال سرخ اور چودہ طبق روشن ہو گئے۔ تایا جانی کا پہلا طمانچہ ہمیں یاد تھا لہٰذا ہم نے رونے دھونے کا پروگرام ملتوی کر کے ایک نعرہ مستانہ بلند کیا "تایا جانی! زندہ باد"۔

اس وقت تک ابا میاں بھی باہر آ موجود ہوئے تھے۔

یہ شاید ان کی عادت تھی یا پیار کرنے کا انداز کہ وہ ہر ملاقات میں طمانچہ ضرور رسید کرتے۔ یہ سوغات ہر خاص و عام کے لئے نہ تھی بلکہ جس پر انہیں زیادہ پیار آتا اور جس پر زیادہ شفقت فرماتے اسے بار بار اور زور دار طمانچہ ملا کرتا۔

خیر طمانچے تو ہم نے اماں بی سے بھی کھائے، کئی مرتبہ بھائی جان نے بھی ہم پر ہاتھ صاف کیا مگر جو مزا، سنسنی اور سنسناہٹ تایا جانی کے طمانچوں میں تھی وہ ہمیں اور کہیں نہ ملی۔

پیار، محبت اور شفقت کا آخری طمانچہ تایا جانی سے ہم نے اس وقت کھایا جب وہ بسترِ علالت پر تھے۔ ان کے نحیف ہاتھوں میں گو کہ سکت نہ تھی مگر ہمیں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک اور اس کے بعد ہمارے گال پر سرخی دوڑ گئی۔ یہ طمانچہ ان کا آخری طمانچہ ثابت ہوا۔ لیکن اس میں نہ وہ سنسنی تھی جو چودہ طبق روشن کر دیتی اور نہ وہ سنسناہٹ جو کئی لمحے ہمارے کانوں میں گونجتی۔ البتہ دکھ کا ایک سیلاب تھا جو ہماری آنکھوں سے نکل کر ہمارے گالوں کو بھگو رہا تھا۔

آج بھی جب کبھی ہمیں تایا مرحوم یاد آتے ہیں تو اسی طرح گالوں میں سنسناہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اب ہمارے گال سرخ نہیں ہوتے بلکہ بھیگ جاتے ہیں.....!!

مینڈک

متعدد مشرقی ملکوں میں لوگ مینڈک بڑے شوق اور رغبت سے کھاتے ہیں۔ برما، چین، اور جاپان میں ان کا اچار ڈالتے اور چربی بطورِ روغن استعمال کرتے ہیں۔ جاپان میں ان کی کھال سے بڑے خوبصورت بٹوے تیار ہوتے ہیں، مگر امریکہ میں ان سے جو کام لیا جاتا ہے وہ سب سے انوکھا اور دلچسپ ہے۔ مینڈک کے جسم سے ایک خاص نوعیت کا رقیق مادہ نکلتا ہے جو اپنی ایک الگ اور مخصوص کیمیاوی تاثیر رکھتا ہے۔ جنوبی امریکہ کے بعض علاقوں میں ایسے مینڈک موجود ہیں جن کے جسم سے خارج ہونے والا مادہ نہایت زہریلا ہوتا ہے۔ ریڈ انڈین اپنے تیر اس زہر میں بجھاتے ہیں۔ کولمبیا کے لوگ طوطے پالنے کے شوقین ہیں۔ ایمیزن کے طوطے انہیں بڑے پسند ہیں، مگر انہیں انکے پروں کا سبز اور نیلا رنگ بالکل نہیں بھاتا۔ اس رنگ کو بدلنے کے لئے وہ مینڈک سے کام لیتے ہیں۔ طوطے کے پر نوچ کر اس کے جسم سے زندہ مینڈک اچھی طرح رگڑتے ہیں تاکہ مینڈک کی ساری رطوبت طوطے کی جلد میں جذب ہو جائے۔ اس عمل کے بعد طوطے کے جو نئے پر نکلتے ہیں، ان کا رنگ سبز اور نیلا ہونے کے بجائے شوخ زرد ہوتا ہے جو یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ رنگ ہے۔

شمالی امریکہ میں ایک نہایت تیز طرار مینڈک "بل ڈاگ" پایا جاتا ہے۔ یہ مینڈک چلتے وقت آٹھ آٹھ اور دس دس فٹ لمبی چھلانگیں لگاتا ہے۔ ان کی دوڑ کے مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ لوگ اس نسل کے اچھے پتھے مینڈک پکڑ کر انہیں دوڑ لگانے کی تربیت دیتے ہیں۔ اللہ بلوچ۔ حب چوکی

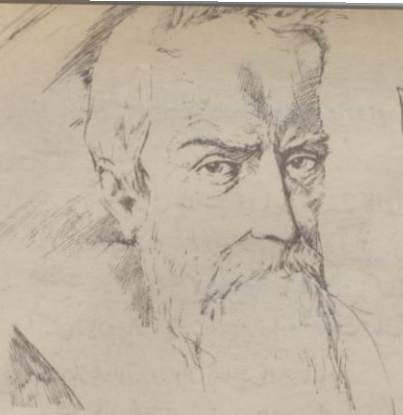

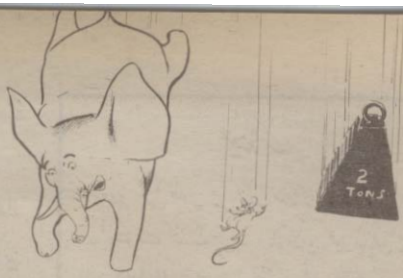

چیزیں گرنے کا قانون کیا ہے

نگہت آرا چوہان

کسی ایسی چیز کا نیچے کی طرف گرنا جسے کوئی سہارا حاصل نہ ہو کشش ثقل کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ کششِ ثقل زمین کی وہ طاقت ہے جو چیزوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جب ہوا کی کوئی مزاحمت نہ ہو تو تمام اشیا ایک خاص قانون کے مطابق گرتی ہیں۔ اسے اشیا گرنے کا قانون کہا جاتا ہے جسے پندرویں صدی میں مشہور اطالوی سائنس دان "گلیلیو" نے دریافت کیا تھا۔ چیزیں گرانے کا یہ تجربہ اس نے اپنی تجربہ گاہ میں کیا تھا اور ان تجربات کے نتیجے میں یہ قانون وجود میں آیا کہ "ہوا کی غیر موجودگی میں کسی شے کے گرنے کی رفتار اس پر منحصر ہوگی کہ وہ کتنی بلندی سے نیچے گرتی ہے اور اس رفتار کا شے کے وزن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

کوئی شے جتنی دیر تک نیچے گرتی رہے گی اس کی رفتار اتنی ہی تیز تر ہوتی جائے گی۔ جب کوئی شے رفتار پکڑ لیتی ہے تو ہم اسے "اسراع" کہتے ہیں۔ ایک آزادی سے گرتی ہوئی شے کا اسراع ایک سیکنڈ میں دس میٹر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شے گرتی ہے تو ہر سیکنڈ پر اس کی رفتار میں نیچے کی طرف دس میٹر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک گرتی ہوئی شے کی رفتار ایک سیکنڈ بعد دس میٹر ہوتی ہے اور دوسرے سیکنڈ کے بعد بیس میٹر ہو جاتی ہے۔

لیکن ہوا سے گزرتے ہوئے شے کی یہ رفتار باقی نہیں رہتی۔ ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے ہر شے کے گرنے کی رفتار کی ایک خاص حد ہوتی ہے۔ یہ بات بھاری اشیا کے بارے میں بھی درست ہے۔ جب وہ گرتی ہیں تو اسراع کا عمل شروع ہو جاتا ہے لیکن ہوا کی مزاحمت بھی پیدا ہوتی ہے۔ جلد ہی ہوا کی مزاحمت اور شے پر کشش ثقل کا تناسب یکساں ہو جاتا ہے پھر یہ شے زیادہ تیز نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ اپنی ٹرمینل اسپیڈ کو پہنچ چکی ہوتی ہے اور گرنے کے دوران یہ رفتار یکساں رہتی ہے۔

قلم کا سفر

نیان احمد مدنی

رات سیفی اپنے بستر پر لیٹا تو ماسٹر صاحب کی وہ بات پھر اسے یاد آگئی جو انہوں نے اس کی کاپی پر "فیئر" کے ریمارکس دیتے ہوئے کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا "سیفی اگر تم ذرا سی محنت اور کر لو تو اپنے "خوشنما خط" کی بدولت تم امتحان میں بڑے اچھے نمبروں سے پاس ہو سکتے ہو۔" ماسٹر صاحب کے اس جملے پر غور کرتے ہوئے اس نے اپنے قریب میز پر رکھے ہوئے کلک کے قلم، دوات اور تختی کو بڑے پیار سے دیکھا جنہوں نے اسے اپنے استاد کی نظر میں نمایاں مقام دلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ عقیدت مندی کا اظہار کرنے کے لئے اس نے قلم دوات اور تختی کو چھونے کے لئے

بے اختیار اپنے ہاتھ میز کی طرف بڑھائے کہ اچانک بجلی چلی گئی اور کمرہ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ وہ گھبرا کر بستر سے اٹھ بیٹھا اور اندھیرے میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس نے امّی کو آواز دینے کی کوشش کی مگر آواز جیسے اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور اس وقت تو وہ خوف اور گھبراہٹ کے مارے اچھل کر کھڑا ہو گیا جب دروازہ سے سبز رنگ کی روشنی کی ایک لکیر اندر داخل ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا کمرہ جگمگا اٹھا۔ اس عجب سی روشنی میں یوں تو کمرہ کی ہر چیز چمک رہی تھی لیکن سیفی کے لئے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بستر پر رکھے ہوئے قلم دوات اور تختی کے گرد اجلا سب سے زیادہ تھا اور سبز روشنی کی اس طلسمی لکیر نے ان کے چاروں طرف ایک ہالہ سا بنا دیا تھا اور پھر سیفی اس سیٹی جیسی آواز سے چونک پڑا جو بظاہر قلم کی نوک سے نکل رہی تھی۔ سیفی نے سنا، قلم کہہ رہا تھا "سیفی میاں آپ شاید ڈر رہے ہیں مگر بھئی ڈرنے کی کوئی بات نہیں، آج تو میں بھی بہت خوش ہوں اور آپ کو شاباشی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی بہترین ہینڈ رائٹنگ سے اپنے ماسٹر صاحب کا جی خوش کر دیا۔ اگر آپ اسی طرح مجھے اپنا دوست اور دوات و تختی کو اپنا ساتھی بنائے رہے تو ایک ماسٹر صاحب ہی کیا آپ تو پوری دنیا کا جی خوش کر دیں گے۔" قلم کی زبان سے نکلنے والے ان جادو بھرے لفظوں نے بے چین اور خوفزدہ سیفی کو پُر سکون کر دیا اور اس پر چھائے ہوئے خوف اور دہشت کے سائے دور ہو گئے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور پیار بھرے لہجے میں اس نے قلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "قلم میرے ساتھی، میرے دوست! اچھا ہوا کہ اللہ میاں نے تمہیں مجھ سے باتیں کرنے کے لئے زبان دے دی۔ میں تو خود ایک عرصہ سے تم سے بہت سی باتیں کرنا اور پوچھنا چاہتا تھا۔" "ہاں ہاں ضرور۔" قلم بولا مگر یہ تم نے کیا کہا کہ اللہ میاں نے مجھے زبان دے دی، ارے بھئی زبان تو مجھے اللہ میاں نے اوّل روز سے ہی دے رکھی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ میں اپنی زبان کا استعمال دوسروں کے لئے کرتا ہوں وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں میرے ہی ذریعے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ تمہارے بڑوں کی لکھی ہوئی کتابیں رسالے اور اخبارات یہ سب میری ہی زبان کے ذریعے تو تم تک پہنچ رہے ہیں۔ میں اگر درمیان میں نہ ہوتا تو رابطہ کا کام کون انجام دیتا؟ اور تم لوگ علم و ہنر کی منزلیں کس طرح طے کرتے؟" "یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست مگر میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو اس وقت تمہیں بولتے دیکھ کر اس لئے خوش ہوا کہ چلو تم سے باتیں کرنے اور تم سے تمہارے بارے میں جاننے کی میری دلی آرزو کے پورا ہونے کا موقع تو آیا۔" "اچھا تو تم مجھ سے میری کہانی سننا چاہتے ہو!" قلم نے سیفی کے دل کی بات بھانپتے ہوئے کہا۔ "ہاں میرے دوست! تم ٹھیک سمجھے۔" سیفی نے اپنے جذبۂ شوق پر قابو

اس نے اپنے تمام بندوں کی "لوحِ تقدیر" میرے ہی ذریعہ محفوظ کی اور اپنے پاک کلام میں بھی ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں نے انسانوں کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انہیں وہ کچھ علم دیا جو وہ نہیں جانتے تھے۔" مگر بھئی! دنیا میں میرے وجود اور میری ترقی کا راز معلوم کرنے کے لئے تمہیں میرے ساتھ مختلف زمانوں اور ادوار کا سفر کرنا ہو گا، کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟" سیفی نے حامی بھرتے ہوئے سوال کیا۔ "مگر تم مجھے لے کہاں جاؤ گے؟" "ارے بھئی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس تم اپنی آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہ کہوں آنکھیں بند ہی رکھنا۔" اور پھر آنکھیں بند کرتے ہی سیفی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا ہاتھ پکڑے کوئی دور بہت دور اڑائے لئے جا رہا ہو۔ چند لمحے اسی کیفیت میں گزر گئے۔ اچانک قلم کی آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی "آنکھیں کھول دو۔" اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک حیرت انگیز منظر اس کے سامنے تھا۔ وہ ایک مدرسہ جیسی عمارت تھی۔ ایک بڑے سے مگر کچے کمرہ میں عجیب حلیہ کے کچھ لوگ ہاتھوں میں نوکدار کڑیاں لئے بیٹھے تھے ان کے سامنے گیلی مٹی کی تختیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ ان پر کچھ لکھنے یا کھودنے میں مصروف تھے۔ "تم نے دیکھا۔" قلم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی "یہ سنِ عیسوی سے

کڑی کی شکل میں ایجاد کیا اور اپنے اظہار خیال کے لئے گیلی مٹی سے بنی ان تختیوں پر مجھے استعمال کیا۔ یہ تختیاں جب خشک ہو جاتیں تو اس پر بنے نقش و نگار واضح شکل اختیار کر لیتے اور میرے ذریعے وجود میں آنے والی اسی ابتدائی تحریر کو نوکیلی شکل کے نام سے شہرت ملی۔" ابھی سیفی اس منظر اور قلم کے دلچسپ بچپن کو نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکا تھا کہ پھر آنکھیں بند کرنے کا حکم ملا۔ اس بار جب اس نے قلم کے کہنے پر آنکھیں کھولیں تو خود کو کسی بادشاہ کے دربار میں کھڑا پایا۔ سامنے سونے کے تخت پر بادشاہ بیٹھا تھا اور اس کے دونوں جانب دور دور تک امرائے دربار زرق برق لباس پہنے مؤدب اور خاموش بیٹھے تھے۔ بادشاہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے تخت کے بالکل نیچے دو آدمی پروں کی مدد سے کسی چیز پر مسلسل کچھ لکھے جا رہے تھے۔ وہ لکھتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ان پروں کو جھٹکتے بھی جا رہے تھے۔ عجیب پراسرار ماحول تھا۔ سیفی کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دفعتہً اسے قلم کی آواز پھر سنائی دی۔ "سیفی میاں! یہ ۵۰۰ سال قبلِ مسیح کا زمانہ ہے تم دیکھ رہے ہو کہ اس دور کے لوگوں نے مجھے ہنس بگلے اور ٹرکی (ایک پرندہ) کے پَر میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے ان پرندوں کے خشک اور صاف کئے ہوئے پروں کے حصہ کو کسی دھار دار آلے کی

تاکہ اس کا یقین کرلیں کہ روشنائی ساتھ دے رہی ہے یا نہیں۔ یہاں میں تمہیں یہ بھی بتادوں اس دور سے کچھ پہلے جو تمہاری نظروں کے سامنے ہے، مصر کے لوگوں نے میرے جسم کو کلک اور سرکنڈے کی شکل میں تبدیل کر ڈالا تھا۔ وہ کلک اور سرکنڈے کو کاٹ کر بڑی صفائی سے ایک جانب نوک نکال لیتے اور پھر کالک سے بنی روشنائی کی مدد سے مجھے آسانی سے اپنے کام میں لے آتے۔"

"مگر قلم میرے دوست! تم نے اس کے بارے تو مجھے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کب اور کیسے دریافت ہوئی اور کس نے اسے سب سے پہلے استعمال کیا؟" سیفی نے قلم کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں واقعی یہ تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا کہ حضرت عیسیٰؑ سے تیرہ سو سال پہلے چینیوں اور مصریوں نے جلتے ہوئے چراغ کی لو سے بننے والی کالک کی مدد سے روشنائی بنائی۔ انہوں نے یہ روشنائی چراغ کی کالک کو پانی اور گوند میں حل کر کے تیار کی اور پھر جلد ہی زمین کے اندر موجود مختلف جڑوں کی مدد سے انہوں نے مختلف رنگوں کی روشنائی بھی بنانا سیکھ لی۔ اچھا ذرا اب پھر اپنی آنکھیں بند کرو۔" تھوڑی دیر بعد جب قلم کے کہنے سے سیفی نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں تو خود کو بعض ایسے لوگوں کے درمیان پایا جن کی شکلیں اور وضع قطع چینیوں جیسی تھیں۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں میں انوکھے قسم کے برش پکڑے

"یہ سیکڑوں سال پہلے کے چینی باشندے ہیں جنہوں نے اونٹ اور چوہے کے بالوں کے گچھوں کو بھگو کر لکڑی سے باندھ رکھا ہے۔ ان برش نما قلموں سے یہ لوگ لکھنے اور نقش و نگار بنانے کا کام کرتے ہیں اور کام سے فارغ ہو کر یہ اپنے ان برشوں کو کھوکھلے کلک کے اندر محفوظ کر لیتے ہیں۔ سیفی میاں! تم یہ جان کر حیران ہو گے کہ ان چینیوں نے چینی حروف تہجی کے ۱۰۰۹۰ یا اس سے بھی زائد حروف اس قسم کے ۸ برش نما قلموں سے لکھ رکھے ہیں۔" قلم نے مزید کہا "یہ بات بھی تمہارے لئے ایک دلچسپ انکشاف ہو گی کہ عہدِ وسطیٰ میں لوگ پروں سے بنے قلموں سے انتہائی دلکش تحریریں لکھا کرتے اور اس کا ثبوت پندرھویں صدی عیسوی میں شاہ ہنری آف کیسائل کی تاج پوشی سے متعلق وہ تحریری ریکارڈ ہے جس کی حد درجہ خوبصورت تحریر آج بھی اعلیٰ درجہ کی خوش خط تحریروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اور بھئی! جسے دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ پروں سے بنے قلم کی جادو گری ہے۔" "مگر کلک اور سرکنڈے کے قلم سے لکھائی کی بات ہی کچھ اور ہے۔" سیفی نے بات کاٹی۔ "ہاں یہ بات کسی حد تک صحیح ہے مگر کھردرے کاغذ اور کپڑوں کے ٹکڑوں پر مسلسل لکھتے رہنے سے ان قلموں کی نوکیں جلد خراب ہو جایا کرتی تھیں اور لکھنے والوں کو

بار بار مجھے کاٹ کر نوکیں ٹھیک کرنی پڑتی تھیں مگر سترھویں صدی میں ایک ایسا آلہ ضرور ایجاد ہو گیا جس کی مدد سے میری خراب نوکیں بہت صفائی سے ٹھیک کرلی جاتی تھیں اور میں روانی سے چلنے لگتا تھا کلک اور سرکنڈوں کے بعد مجھے ہولڈر، فاسبرین فاؤنٹین پن اور بال پین کی جدید شکلوں میں پیش کیا گیا اور اب لوگ مجھے انہیں نئی شکلوں میں اپنے قریب رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

اچھا اب تم پھر آنکھیں بند کرو تو میں تمہیں بعض ایسی شخصیات سے ملواؤں جو مجھے جدید اور کار آمد شکل و صورت عطا کرنے میں بہت مشہور ہوئیں اور جن کا نام علمی حلقوں میں آج بھی بڑے ادب اور احترام سے لیا جاتا ہے۔" مگر وہ ہیں کون؟" سیفی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بھئی وہ ایڈیسن واٹرمین ہیں جنہوں نے ۱۸۸۴ء میں فاؤنٹین پن ایجاد کیا۔ جان ایچ لاؤڈ ہیں جو ۱۸۸۰ میں بال پوائنٹ کے موجد بنے۔ ہنگری کے جوزف اور جارج بیرو ہیں جنہوں نے اس بال پوائنٹ کو ۱۹۴۰ء میں موجودہ شکل دی۔ سیفی نے ان بڑے لوگوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے شوق میں جلدی سے آنکھیں بند کرلیں لیکن اب جو آنکھیں کھولیں تو سورج کی کرنیں سارے کمرہ میں نور بکھیر رہی تھیں۔ اس کی امی کا پاکیزہ چہرہ اس کے سامنے تھا جو کہہ رہی تھیں "بھئی اب اٹھ جاؤ کیا آج اسکول جانے کا ارادہ نہیں اور ہاں ابھی تو تمہیں تختی بھی لکھنی ہے۔" سیفی نے پلٹ کر میز کی جانب دیکھا، قلم دوات اور تختی اسی طرح میز پر موجود تھے لیکن اب رات والی طلسمی سبز روشنی کی جگہ سورج کی کرنیں ان کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھیں وہ سوچ رہا تھا کہ امی کو کیسے بتائے کہ اس نے کیسا انوکھا مگر دلچسپ خواب دیکھا ہے۔

دوستی

آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

جب تم کسی کو اپنا دوست بناؤ تو اس سے جنگ نہ کرو۔ اس پر اپنی برتری کا اظہار نہ کرو۔ اس کی نگرانی نہ کرو اور دوسروں سے اس کے بارے میں پوچھتے نہ پھرو کیوں کہ ممکن ہے اس کا دوست تمہیں کوئی غلط بات بتا دے اور غلط فہمی تمہاری جدائی کا سبب بن جائے۔

چار مقولے

○ ..... آدمی اسی وقت تک عالم ہے جب تک طالب علم رہے اور اس وقت سے جاہل ہے جب سے طالب علمی چھوڑ دے۔

○ ..... جو کوئی علم سیکھنے میں شرماتا ہے اس کا علم بھی گھٹیا ہوتا ہے۔

○ ..... علم کا چھپانا ہلاکت ہے اور عمل کا چھپانا نجات ہے۔

○ ..... زیادہ بحث و مباحثے سے عمل گم ہو جاتا ہے۔

(مرسلہ۔ ملک طارق محمود، گولارچی)

مزید محنت کی ضرورت ہے

ہمیں سینکڑوں کی تعداد میں ایسی تحریریں موصول ہوتی ہیں جو معیاری، مختصر اور دلچسپ نہ ہونے کی وجہ سے ناقابل اشاعت قرار پاتی ہیں ہم تمام ساتھیوں کو خطوط کے ذریعے مطلع نہیں کر سکتے لہٰذا ہر مہینے ایک صفحہ ناقابل اشاعت تحریروں کے لئے مختص کر رہے ہیں۔

"محترمہ فاطمہ جناح" شیخ ظل ہما حمید، کاموکے۔ "دنیا کے بڑے پل" محمد یونس حسین، ناظم آباد (کراچی۔) "انسان دوست ڈیوڈ لونگٹن" شیخ محمد عاکف حمید، کاموکے "وقت کی بات" "عجائبات عالم" "اردو صحافت کے ستون" "بارش" "وقت کی بات" "نصیحت" "دلچسپ و عجیب" "آب و ہوا" "فضائی آلودگی" "کشمیر" (نظم) سید حسنین عباس ہمدانی، راولپنڈی۔ "ہمیشہ نام رہے خدا کا" راشد منہاس ثاقب، برجکلاں (قصور) "" چند عجائبات دنیا" عباس حیدر شیخ، ہالا (سندھ) "سپائیڈر نے خود کو موت سے کیسے بچایا" فیصل مغل کراچی۔ "غزوات" "پاکستان کے بارے میں مختصر معلومات" سید حسنین عباس ہمدانی، راولپنڈی۔ "فریب" محمد رفیق دانش، حیدر آباد۔ بقر عید نامہ (نظم) آصف وقار آصف، واہ کینٹ۔ "محنت کی جیت" سید فیصل علی کاظمی، کراچی "لالچی بڑھیا" کمار لال، کندھ کوٹ۔ "لے کر رہیں گے اب کشمیر" (نظم) "گرمی" (نظم) صبیحہ اعجاز، کراچی۔ "قبر کی یاد" صفیہ رحمٰن، حضرو۔ "ٹیلی وژن" فرح مراد، کراچی۔ "جاپان" نثار احمد ہاشمی، کراچی۔ "فضا کی تسخیر" محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ "خلائی مخلوق" حسن فرخ، لاہور۔ "اونٹ کی تلاش" راج کمار، بخشاپور (سندھ) "دنیا کے عجوبے" یاسر بن نثار، راولپنڈی۔ "کامیابی کے راز (؟) "لندن کی پولیس" ریحان مجید، لاہور کینٹ۔ "ودیعت نبوت" عامر اعجاز، ڈنگہ "بکرے کی قربانی" منصب محمود، عارف والا۔ "کہنا بڑوں کا مانو تم" عشرت علی، ساہیوال۔ "صلہ شہید کیا ہے" افتخار محبوب، لاہور۔ "ذمہ دار کون؟" محمد حفیظ مبین، سکھر (سندھ) "مگر مچھ" "اپنڈکس" "موجد اور ایجادات" عبدالغیاث فردوس، دالنبدین۔ "ہونہار بچے کا کارنامہ" راشد منہاس ثاقب برجکلاں (قصور)۔ "دھوکے باز کرمو" محمد قاسم طالب، لاہور۔ "لالچ" حیدر علی پنہور، راجو خانانی۔ "جرثومے کی آپ بیتی" وحید عامر، بوریوالہ۔ "عورت، بکری اور شیر" نعیم مشتاق نومی، کلر کہار۔ "شرم سے پانی ہونا" عندلیب زہرہ، راولپنڈی۔ "ہوشیار لڑکا" سعادت علی شاہ، چکوال۔ "ٹلو اور ببلو کی بہادری" ملک محمد فیصل (؟)

"ہمارا جھنڈا" (نظم) عمران الدین، کراچی۔ "ماں عظیم چیز ہے" بابر (؟) "شرمندگی" طیبہ طاہرہ ہاشمی، نارووال۔ "خدا کی لاٹھی بے آواز" صائمہ شکیل، کامرہ۔ "ندا کی گڑیا" (نظم) عندلیب زہرا، راولپنڈی۔ "پودوں کی قوت سماعت کے انکشافات" سردار خان، دریا شریف۔ "سردیوں کی یاد" (نظم) راحت حسین نقوی، کراچی۔ "یادیں" "بارش کی یاد" (نظم) راحت حسین نقوی، کراچی۔ "انجام" جمیل احمد جمالی، (؟) "چوری کا انجام" خالد بشیر پشاور۔ "قوم کو تیری ضرورت ہے" ادیبہ ناز، ڈیرہ غازی خان "ڈی سی صاحب" سعدیہ ناہید، گجرات۔ "شہزادہ سیف الملوک کی کہانی" راحیل ضیا، ایبٹ آباد۔ "جسے اللہ رکھے" طلال ناصر، لاڑکانہ "یمن کا قاضی" زرتاج شامی، کراچی۔

ننھی ندائن کا گڑیا گھر

تارا جعفری

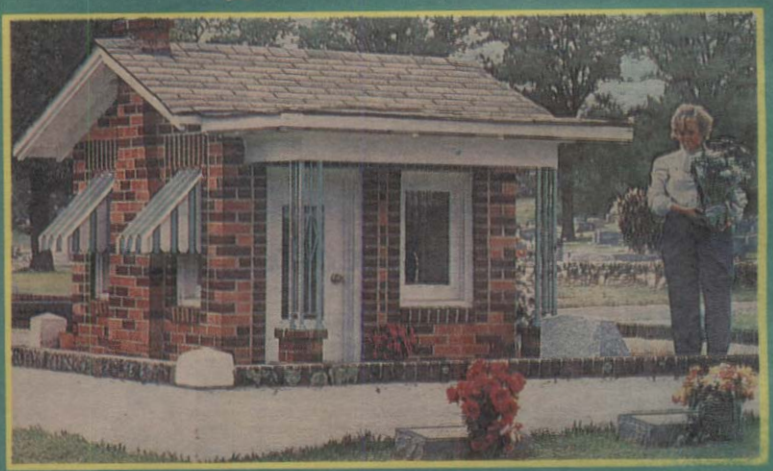

اوپر کی تصویر میں ایک قبر ننھی ندائن ارلیس کی ہے۔ اس بچی کی خواہش تھی کہ اس کے پاس پیارا سا ایک گڑیا گھر ہو جس میں خوب ساری گڑیاں اور کھلونے ہوں۔ مگر اس کی خواہش پوری ہونے سے پہلے نمونیا میں اس کا انتقال ہوگیا۔ غمزدہ والدین نے اس کی قبر کے سامنے ایک خوب صورت گڑیا گھر تعمیر کیا۔ اوپر کی تصویر میں بچی کی بھابھی ندائن اور اس کے والدین کی قبروں کے نزدیک پھول لئے کھڑی ہے جبکہ نیچے کی تصویر میں گڑیا گھر کے اندر کا منظر دکھایا گیا ہے۔ گڑیا گھر میں کئی گڑیا، ندائن کے کھلونے، اسکی تین پہیوں والی سائیکل کے علاوہ ندائن کی ایک تصویر بھی رکھی ہے۔

یہ برفانی چوزے کے غسل کا وقت ہے ۔ نہانے کے بعد ہیئر ڈرائیر سے پروں
کو خشک کیا جا رہا ہے ۔ مرغیاں پالنے والوں کو یہ ناز بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

میاں چوزے کاندھے پر سوار
سیر کے لئے نکلے ہیں ۔

اس مرغی کے پروں کو صاف کرنے کی ضرورت
نہیں پڑتی ۔ یہ خود ہی اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر
صاف کر لیتی ہے ۔

ککڑوں کوں ۔ کتنا پیارا۔

لال بھبھوکا مرغا پولینڈ میں رہتا
ہے ہمیشہ لڑائی بھڑائی پر آمادہ

یہ ٹی وی پروگرام کلیاں" والی ماسی مصیبتے نہیں بلکہ پولش خاتون مرغی ہیں

اونچی پگڑی والا ۔ پولینڈ کا مرغا

انوکھی مرغیاں

منور سلطانہ فاروقی

مرغیاں صدیوں سے انسان کی دوست ہیں۔ ہم ان سے انڈے، چوزے اور گوشت حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہم انسانوں کے لئے بڑی صحت بخش غذا ہیں۔ مثلاً چوزوں کا سوپ بیماروں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ اُبلے ہوئے انڈے بھی کالی مرچ اور نمک کے ساتھ کھانسی کے مریضوں کو تجویز کرتے ہیں۔ سردیوں میں انڈے کا حلوہ، دعوتوں میں مرغ پلاؤ، چکن روسٹ اور چکن کارن سوپ، چکن قورمہ اور چرغا۔ یہ سارے پکوان صرف اور صرف مرغ کی بدولت ہمارے دستر خوان کی زینت بنتے ہیں۔

مرغیاں پالنا بھی ایک فن ہے اور آج کل تو یہ بہت بڑی صنعت بن چکا ہے۔ مرغیوں میں بھی کچھ خاص قسم کی مرغیاں ہوتی ہیں۔ ان کا پالنا آسان کام نہیں ہے۔ ان کو وقت پر غذا فراہم کرنا، پانی پلانا ان کے رہنے کی جگہ کی صفائی کرنا، انہیں نہلانا ان کے پروں، کلغی اور چونچ کی صفائی تاکہ وہ جوؤں اور کیڑوں سے محفوظ رہیں۔ غرض یہ کہ جن لوگوں کو عجیب و غریب مرغیوں کے مالک رہنے کا شوق ہوتا ہے وہ ان مرغیوں کے سارے نخرے برداشت کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ مرغیاں بھی زبان اور سمجھ رکھتی ہیں۔ انہیں بلایا جائے تو دوڑ کر آتی ہیں۔ جب انڈا دیتی ہیں تو اپنے مالک کو خوش خبری دینے کے لئے بانگ دیتی ہیں۔ کوئی غیر مرغا یا مرغی ان کے علاقے میں آجائے تو شور مچا کر یا اسے چونچوں سے مار مار کر بھگا دیتی ہیں بلی، کتا یا کوئی خطرناک جانور ان کے قریب آئے تو شور مچا کر مالک کو اطلاع کرتی ہیں اور سب سے بڑھ کر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بانگ دے کر سونے والوں کو جگاتی ہیں اور ہلکی موسیقی انہیں سنائی جائے تو سو جاتی ہیں۔

سامنے کے صفحے پر آپ کی دلچسپی کے لئے چند عجیب و غریب مرغیوں کی تصویریں پیش کی گئی ہیں جو یقیناً آج سے قبل آپ نے نہیں دیکھی ہوں گی۔

انعامی مقابلہ

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

۱۔ چند افراد پر مشتمل ایک خاندان ایک ہی گھر میں رہتا ہے۔ ان میں ایک باپ ہے، ایک ماں ہے، ایک بھائی ہے، ایک بہن ہے، ایک شوہر ہے، ایک بیوی ہے، ایک بیٹی ہے، ایک بیٹا ہے، ایک سسر ہے، ایک ساس ہے، ایک ماموں ہے، ایک پھوپھی ہے، ایک بھانجا ہے، ایک بھتیجی ہے، ایک داماد ہے، ایک بہو ہے۔ بتایئے اس خاندان میں کم از کم کتنے افراد ہیں؟

۲۔ آپ کے پاس پنیر کا ایک بڑا ٹکڑا ہے۔ اسے سات بچوں میں تقسیم کرنا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب کو برابر حصہ ملے البتہ یہ ضروری ہے کہ ہر کسی کو پنیر کے دو ٹکڑے ملیں، چھوٹے یا بڑے۔ آپ کو اس مقصد کے لئے پنیر کے اس بڑے ٹکڑے کو چار مرتبہ کاٹنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۳ ــ جاوید، معین اور اقبال تین دوست تھے۔ ایک دن انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گاؤں جائیں گے۔ گاؤں شہر سے تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ ان کے پاس صرف ایک چھوٹی موٹر سائیکل تھی جس پر صرف ایک ہی آدمی سفر کر سکتا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ وہ باری باری موٹر سائیکل پر سواری کریں گے۔ جاوید نے سب سے پہلے اپنی باری لی اور اپنے حصے کا سفر طے کر کے گاڑی دوسروں کے لئے چھوڑ دی۔ جب معین اور اقبال موٹر سائیکل کے پاس پہنچے تو معین نے گاڑی سنبھالی اور سفر کا اگلہ مرحلہ طے کیا۔ آخری مرحلے میں اقبال نے موٹر سائیکل پر سفر کیا۔ ہر شخص نے پیدل سفر تین کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کیا جبکہ موٹر سائیکل سبھی نے تیس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی۔ آپ یہ بتائیے کہ اگر یہ تینوں دوست ایک ہی وقت گاؤں پہنچیں تو جاوید اور معین نے نقطۂ آغاز سے کتنے فاصلے پر موٹر سائیکل چھوڑی تھی؟

۴ ــ لو دھراں اسٹیشن سے سکھر کے لئے ایک گاڑی ہر گھنٹے کے بعد روانہ ہوتی ہے۔ سکھر اسٹیشن سے بھی ہر گھنٹے کے بعد ایک گاڑی لو دھراں کے لئے چلتی ہے اگر ایک طرف کا سفر طے کرنے میں تین گھنٹے لگتے ہوں تو بتائیے کہ سکھر سے لودھراں جانے والے ایک گاڑی کو لودھراں سے سکھر آنے والی کتنی گاڑیاں ملیں گی ؟

گزشتہ ماہ کے سوالوں کے

دُرست جوابات۔

۱۔ ایک کلو چائے کی پتی کی قیمت ۱۰۰۰۱ روپے ہے۔

۲۔ سوال غلط تھا۔

۳۔

۴۔ سب سے پہلے ۹ سکّوں کو تین تین کے گروپ میں تقسیم کیا جائے گا۔ پھر ترازو کو پہلی مرتبہ استعمال کرتے ہوئے ایک گروپ کو ایک پلڑے میں اور دوسرے گروپ کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر وزن ہو گا۔ جس پلڑے میں ہلکا سکّہ ہو گا، وہ اٹھ جائے گا۔ پھر اس گروپ کے ایک سکّے کو ایک پلڑے میں اور دوسرے کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائیگا۔ اگر دونوں کا وزن برابر ہو گا تو تیسرا سکّہ ہلکا ہو گا۔ اگر پہلی مرتبہ دونوں گروپ برابر ہوں گے تو ہلکا سکّہ تیسرے گروپ میں ہو گا جسے مندرجہ بالا طریقے سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والی خوش نصیب۔

ثوبیہ طاہر، پنڈی گھیب

بالکل درست جواب دینے والے ساتھی۔

بابر ادریس، لاہور۔ شہزاد محمود، کمالیہ۔ علی رضا، کمالیہ۔ ریحانہ شکیل، کراچی۔ مہوش خان، کراچی۔ غلام ڈوگر، کمالیہ۔ فلذا عروج، کراچی۔ روبینہ ناز، خانیوال۔ پروین کنول، کراچی۔ ندیم شاہد، مخدوم پور پہوڑاں۔ جمیلہ عندلیب، وہاڑی۔ فیصل عمران، کمالیہ۔ ساجدہ پروین، کمالیہ۔ محمد ظفر اللہ ضیا، کمالیہ۔ حارث شکیل، شارب شکیل، وقاص احمد، شمائلہ شکیل، حمیرا شکیل، کراچی۔ یاسر بن صغیر، اسد بن صغیر، تہمینہ ناز، دریا خان۔ محمد اکرم، محمد اسلم، بھکر۔ حنا کنول، کراچی۔ یاسمین ناز، لاہور۔ عنبرین خان، بہاول پور۔ شانی اختر، احمد پور شرقیہ۔ امت المعین ، ڈیرہ غازی خان۔ ندیم اشفاق، نعیم اشفاق، راحیل اشفاق، فہیم اشفاق، منڈی بہاؤ الدین۔ نثار احمد، مظفر گڑھ۔ طاہر شمیم، فیصل آباد۔ سہیل افضل، راولا کوٹ۔ ایاز خان، مری۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھی۔

ریاض اسرار بیگ، کراچی۔ طاہر عنائت، پشاور۔ حسن رضا، کامرہ۔ خلیفہ احمد جواد صدیقی، ملتان۔ محمد علی یاسین، حیدر آباد۔ عمران بشیر و کراچی۔ طاہر ندیم، گوجرانوالہ۔ ذوالفقار احمد، لاہور۔ آغا وسیم حیدر، آغا منصور حیدر، آغا مدثر حیدر، آغا محمد رضا، سہیل عزیز خان، حنا تبسم، کراچی۔ تیمور قریشی، کراچی۔ ثاقب حکیم، لاہور۔ اشتیاق احمد علوی، فیصل آباد۔ ارشد عباس، چارسدہ۔ اظہر علی، کراچی۔ بسام وحید، کراچی۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ نوید احمد، میانوالی۔ صبغۃ اللہ احسن، سرگودھا۔

محمد عرفان انصاری، بھکر۔ محمد عمران انصاری، بھکر۔ مرزا محفوظ احمد، جہلم۔ محمد عامر چیمہ، ملتان۔ محمد عمر چیمہ، ملتان۔ ملک نسیم احمد، میانوالی۔ اشفاق احمد قریشی، حیدر آباد۔ عبداللہ خان، حیدر آباد۔ عزیر عبداللہ، کراچی۔ محمد شہزاد احسان، ساگری۔ اشعر فواد، ملتان۔ ثناء صدیقی، (؟) سعد مظہر ڈار، گوجرانوالہ۔ عماد رشید، لاہور۔ سید شجاع الحسنین، کراچی، ساجد کمالوی، کمالیہ۔ رانا محمد عمران، خوشاب۔ شاہد پرویز رانا، خوشاب۔ کرن نوشین عارف، نواب علی پریمی، سانگھڑ۔ سمیر فاروق، ملتان۔ ابتسام ساجد، کمالیہ۔ عبدالسلام، گوندلانوالہ۔ عزیر گل، ایبٹ آباد۔ محمد رضوان قادری، واہ کینٹ۔ طیب عزیز بٹ، ساگری۔ محبوب الٰہی میمن، ٹنڈو آدم۔ سائرہ صدف، رحیم یار خان۔ احمر فرقان، ملتان۔ نوید اختر، جنید اختر، دانش اختر، نازش اختر، جاوید اختر، کراچی۔ منیر اختر، پشاور۔ معین احمد قادری، ڈیرہ اسماعیل خان۔ فوزیہ اسحاق، فرح اسحاق، کراچی۔ حماد احمد، مردان۔ فوزیہ شمیم، عدیل احمد، کراچی۔ ودود الحسن، گجرات۔

ایک سے زیادہ غلطیاں کرنے والے ساتھی۔

عالیہ صدف، سرگودھا۔ خیام افتخار، راولپنڈی۔ محمد اختر قریشی، نسیمہ اختر قریشی، محمد عظیم قریشی، ثنا اختر قریشی، محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔ مہرین یاسین، ذیشان یاسین، (؟) سائرہ انجم، واہ کینٹ۔ عزیز رشید، منڈی مرید کے۔ نعمان محمود کاشمیری، سوہدرہ۔ نفیس احمد، لاہور۔ سارہ علی چوہدری، راولپنڈی۔ عرفات امیر، لاہور۔ حاجی شہزاد حسین اعوان، ملتان۔ مصحف رسول، کراچی۔ محمد عبدالسلام، کراچی۔ نارائن داس۔ آر۔ کھتری، عمر کوٹ۔ عدیل رضا، تلہ گنگ۔ اظہر کمال، کراچی۔ محمد کاشف عبدالقدیر خان، کراچی۔ طاہر روشن، کراچی۔ محمد طاہر اختر، راولپنڈی۔ خواجہ صائم خالد، لاہور۔ محمد عظیم انجم علی زئی، سبتی۔ سید یحییٰ حسینی، کراچی۔ ذیشان آفتاب، واہ کینٹ۔ گلستان، عمران خان، پشاور۔ محمد اویس خان، مردان۔ رانا عبدالغفار رمضان، بھکر۔ فرید ساجد مغل، بھکر۔ محمد عاشق حسین نیازی، تلہ گنگ۔ عبدالعزیز کھتری ماہوڑے والا، کراچی۔ خلیفہ محمد سجاد صدیقی، ملتان۔ سید سفیان کاکاخیل، اسلام آباد۔ سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ سہیل حنیف، محمد ارشد شاہین، امتیاز پٹھان، چارسدہ۔ مجاہد حسین، اظہر اکمل، تابندہ عثمان، فوزیہ منیر، ثمرین خان، عارف والا۔ حسن انظار عثمانی، لاہور۔ گل وقار، کرک۔ سید زاہد حسین شاہ، منڈی مرید کے۔ عبدالرحمٰن، پسرور۔ اکمل حمید، لاہور۔ صابر بھمبرو، کراچی۔

حق

ابنِ آس

رحمان صاحب آج کچھ پریشان سے تھے جب وہ گھر کی دہلیز سے اندر داخل ہوئے تو سامنے دالان میں بیٹھے اظہر نے نظر بھر کر ان کی طرف دیکھا۔ رحمان صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اظہر اس مسکراہٹ کو خوب پہچانتا تھا۔ جس روز ابا جان پریشان اور تھکے ہوئے ہوتے تھے، ان کے چہرے پر ایسی ہی مسکراہٹ ہوتی تھی۔

"کیسی تیاری ہو رہی ہے بیٹا؟" انہوں نے قریب آکر اظہر سے پوچھا۔

"آج آپ جلدی آگئے؟"

"ہاں...... سر میں درد ہو رہا تھا، اس لئے آفس سے چھٹی لے لی"۔ ابا جان نے کہا۔

اظہر نے کتابوں پر نظریں گاڑ دیں، ابا جان اس کے پاس سے گزر کر اندر کمرے کی طرف بڑھ

گئے، کمرے سے اظہر کی امی باہر نکل رہی تھیں۔
"ارے آج آپ اتنی جلدی آگئے، خیریت تو ہے نا!"

"ہاں خیریت ہے، معمولی سا سر میں درد تھا آفس میں ویسے بھی کام نہیں تھا میں آگیا۔" انہوں نے چھینکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو تو زکام ہو گیا ہے، چلئے آپ بستر پر لیٹیں، میں جوشاندہ گرم کر کے لاتی ہوں۔" انہوں نے فکرمندی سے کہا۔

"امی میں ذرا سعید کے پاس جارہا ہوں۔" اظہر نے کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا اور باہر نکل آیا۔

سعید اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہوا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا پارک کی طرف نکل گیا، اور ایک ویران گوشے میں بیٹھ کر کتاب کے ورق پلٹنے لگا اس کی نظریں لفظوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں مگر ذہن میں عجیب سی گرہ بندھی ہوئی تھی۔

"ابا جان بھی عجیب ہیں نہ جانے کب تک مجھے بچہ ہی سمجھتے رہیں گے۔ ہونہہ ..... یہ بھی کوئی زندگی ہے، گھر میں پریشانیاں اور مسائل ہیں اور ابا جان سمجھتے ہیں کہ میں ان حالات میں امتحان کی تیاری کرلوں گا۔" اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

"ابا جان آخر کیوں خود پر ظلم کر رہے ہیں۔ کیوں اتنی محنت کرتے ہیں۔ ہر دوسرے دن طبیعت خراب، آئے دن سر درد..... کیا اتنی محنت کرنا ضروری ہے۔ شام کو آفس سے تھکے ہارے گھر آتے ہیں اور سائیکل پر ٹافیاں، پنسلیں، کاپیاں، بسکٹ اور چھوٹی چھوٹی چیزیں لاد کر پھیری پر نکل جاتے ہیں۔ صرف اور صرف میرے لئے، شگفتہ کے لئے، ہماری پڑھائی کے لئے۔ آخر اس پڑھائی سے ہم کون سا تیر مار لیں گے، کون سے ڈپٹی کلکٹر بن جائیں گے۔ وہ اسی طرح محنت کرتے رہے تو خدا نخواستہ ایک دن....." اظہر جھرجھری لے کر رہ گیا۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔ وہ کتاب اٹھا کر تھکے تھکے قدموں سے گھر کی جانب چل پڑا۔

.....○.....

رحمان صاحب کا معمولی سر درد اور زکام، تپتے ہوئے بخار میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اظہر کی امی کپڑے کی پٹیاں گیلی کر کے ان کے ماتھے پر رکھ رہی تھیں۔ اظہر انتہائی خاموشی سے ان کے پیر دبانے میں مصروف تھا۔ چھوٹی بہن قریب ہی رکھی کرسی پر فکرمند نظروں سے ابا جان کا چہرہ تک رہی تھی۔ ہر ایک خاموش تھا سوائے ابا جان کے..... ان کے منہ سے غنودگی کے عالم میں کراہیں نکل رہی تھیں یا کبھی کبھی اللہ..... اللہ..... کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز نکل جاتی۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ شگفتہ دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگ رہی تھی، "اے اللہ، میرے ابا کی طبیعت بہتر کر دے، انہیں بھلا چنگا کر دے، ان کے بدلے میں مجھے بیمار کر دے۔" وہ بیٹی تھی۔ بیٹیاں باپ کے لئے ایسے ہی جذبات رکھتی ہیں۔

"بیٹا اظہر! کلینک کھل گئی ہوگی، جاذرا بھاگ کر دیکھ تو آ، ڈاکٹر صاحب آگئے ہوں تو انہیں کیفیت بتا کر دوا لے آ۔ کہنا کہ زکام بھی ہے اور سر میں شدید درد ہے۔"

اظہر جلدی سے کھڑا ہو گیا اور چپلیں پہن کر کمرے سے باہر آیا مگر ٹھٹھک کر رک گیا اسے کچھ یاد آگیا تھا شاید امی جان کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ اظہر کو صحن میں رکنا پڑے گا۔ وہ اس کے پیچھے آگئی تھیں۔

"امی وہ ....." وہ ہکلایا۔

"پیسے!! ..... رک! جامیں دیتی ہوں۔"

انہوں نے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اظہر بھی ان کے پیچھے آگیا۔ انہوں نے چائے کی پتی کی برنی کھولی، اس میں صرف ساٹھ روپے تھے۔ انہوں نے بیس روپے اظہر کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

اظہر نے مٹھی بند کر لی اور کن اکھیوں سے امی کی طرف دیکھا جن کے ہاتھ میں صرف چالیس روپے تھے، اسے پتا تھا کہ ابھی مہینہ ختم ہونے میں نو دن باقی ہیں اور چالیس روپے میں نو دن کا گزارہ کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ ساٹھ روپے میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہے ہو؟؟"

امی نے شاید اس کی خاموش زبان دیکھ کر آنکھوں سے چھلکنے والا سوال پڑھ لیا تھا۔

"امی صرف چالیس روپے بچے ہیں۔"

"بیٹا! یہ تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں، تو کیوں فکر کرتا ہے؟"

"لیکن امی!" اظہر نے کہنا چاہا۔

"فضول بحث مت کرو۔" امی نے ڈانٹ کر کلینک کا راستہ بتایا۔

"امی آپ اسے فضول کی بحث کہتی ہیں!" اس کے لہجے میں دبا دبا سا احتجاج تھا۔ شاید آواز بھی قدرے بلند ہو گئی تھی۔

"کلینک نہیں جانا ہے تو صاف کہو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔"

مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑا۔ کلینک کی طرف جاتے ہوئے وہ بُری طرح کھول رہا تھا۔ ایک لاوہ تھا جو اُمڈ کر باہر آنا چاہتا تھا مگر کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

دوسرے دن بھی ابو کی طبیعت درست نہیں ہوئی۔ بخار کی وہی حالت تھی۔ اظہر کی امی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ شگفتہ کونے میں بیٹھی دل ہی دل میں وہ تمام دعائیں دہرا رہی تھی جو اسے یاد تھیں۔ اظہر بیٹھا اپنی کتابوں میں سر کھپا رہا تھا مگر ذہن مسلسل ابا کی طرف لگا ہوا تھا۔

جب ذہن پریشان ہو تو کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ وہ بھی امی اور ابا کو مطمئن کرنے کے لئے کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔ شگفتہ کو کچھ خیال آیا۔ وہ اٹھی اور باورچی خانے میں چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں چائے کے کپ سنبھالے واپس آئی۔

اظہر نے گھونٹ بھرتے ہی اندازہ لگالیا کہ چینی ختم ہو چکی ہے۔ شگفتہ سمجھ گئی اور جلدی سے بولی۔

"بھیا! چینی کم تو نہیں ہے۔"

"نہیں!" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے جھوٹ نکل گیا۔ شگفتہ مطمئن ہو کر امی کی طرف بڑھ گئی اور انہیں چائے دے کر واپس اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

"گھر میں سناٹا ساطاری تھا۔ اظہر کے امتحانات شروع ہونے میں پندرہ دن باقی تھے۔ ویسے تو اس کی تیاری تقریباً مکمل تھی مگر اب اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ناکام ہو جائے گا۔

"امی شام کو کیا پکانا ہے؟" شگفتہ اچانک پوچھ بیٹھی۔

"دوپہر کا سالن پڑا تو ہے۔ ایسا کرو الٹے توے پر اپنے لئے اور اظہر کے لئے روٹیاں ڈال لو۔"

"اور آپ؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" انہوں نے تیزی سے کہا۔

"آپ نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، یہی کہہ دیا تھا کہ بھوک نہیں ہے۔"

امی خاموش ہو گئیں۔ شگفتہ معصوم بچی تھی، اسے یہ بات کیسے سمجھائی جا سکتی تھی کہ کھانا کھانے کے لئے بھوک کے ساتھ کھانے کا انتظام ہونا بھی ضروری ہے۔ ڈبے میں صرف تین روٹیوں

زبان

○ ...... زبان میں ہڈی نہیں لیکن یہ آپ کی کھوپڑی تڑوا سکتی ہے۔

○ ...... قدرت کو زبان کی سختی پسند نہیں اس لئے اس میں ہڈی نہیں بنائی۔

○ ...... بزرگوں کی نصیحت اس پھل کی طرح ہے جس کا مزا شروع میں کڑوا، مگر بعد میں میٹھا ہو جاتا ہے۔

○ ...... مایوسی ایک ایسا بادل ہے جو چھا جائے تو اُمید کے چراغ بجھا دیتا ہے۔

○ ...... احمق موقع کے انتظار میں رہتا ہے اور عقل مند موقع خود ڈھونڈ نکالتا ہے۔

○ ...... بخار ہونے سے پہلے پریشان مت ہو۔

○ ...... ہزاروں موتی بھی ہار نہیں بنا سکتے اگر انہیں پرویا نہ جائے۔

مرسلہ ...... عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ

○ ...... ○ ...... ○ ...... ○

رشوت خوری کا انجام

۸۸ قبل مسیح میں سسلی کے رومن نژاد گورنر مینلینس ایکیوئس کو دس پونڈ سونا رشوت کے طور پر لیتے ہوئے پکڑ لیا گیا۔ عدالت عالیہ نے اسے وہی سونا پگھلا کر پینے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آج تک اتنی کڑی سزا کسی سخت سے سخت الزام میں ملوث مجرم کو بھی نہیں دی گئی۔

مرسلہ: زین اختر، کراچی

کا آٹا موجود تھا۔ اگر وہ بھی کھانے بیٹھ جائیں تو دونوں بچوں کا پیٹ نہیں بھر سکے گا۔ اظہر سب سمجھ رہا تھا' سولہ سال کا نوجوان تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔

اظہر نے بارہا امی سے بات کی کہ ابو کی صحت جواب دیتی جارہی ہے۔ پڑھائی کا کیا ہے؟ اللہ کو منظور ہو گا تو پڑھ ہی لوں گا؟ گھر کے حالات سنوارنے کے لئے مجھے ابو کے ساتھ کام پر جانا چاہئے۔

لیکن ہر بار امی کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

"تمہارا کام صرف پڑھنا ہے اس کے علاوہ تمہیں کچھ نہیں سوچنا۔ ابا صرف تمہاری وجہ سے اتنی محنت کرتے ہیں۔ اگر انہیں پتہ چلے کہ تم پڑھنے کی بجائے کام میں دلچسپی لیتے ہو تو انہیں کتنا صدمہ ہو گا؟"

وہ ہر بار خاموش ہو جاتا تھا۔ امی کی باتوں کے آگے چپ رہنا ہی پڑتا تھا۔ مگر اب تو معاملہ بہت آگے نکل گیا تھا۔

.....○.....

دوسرے دن سے اظہر نے اپنے معمول میں تھوڑی تبدیلی کر لی۔ وہ صبح ہی کتابیں سمیٹ کر امی کو دوست کے گھر جانے کا کہہ کر نکل گیا اور پھر شام ڈھلے ہی واپس آیا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ امی نے گھر میں پڑے ہوئے باقی ماندہ چاول اُبال کر رکھے تھے، اظہر کے چہرے سے ہی انہوں نے تھکن کا اندازہ لگا لیا۔ "کیا ہوا بیٹا! بہت تھکے تھکے نظر آرہے ہو اور یہ سارا دن کہاں غائب رہے؟"

"امی وہ زاہد کے گھر گیا تھا، ہم دو تین دوست اکٹھے بیٹھ کر تیاری کر رہے تھے۔ ارے ہاں ابو کی دوا لائیں آپ؟" اس نے ابو کی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امی خاموش رہیں۔ ان کے لب کچھ کہنے کے لئے کھلے مگر پھر بند ہو گئے۔ اظہر نے پچاس روپے جیب سے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

"یہ..... یہ کہاں سے آئے؟" انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

زاہد سے ادھار لئے ہیں، ابو کی طبیعت سنبھل جائے گی تو دے دیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اور پھر دو تین دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابو کی طبیعت قدرے بہتر ہو گئی تھی۔ آخر چوتھے روز وہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ امی اور شگفتہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ٹھیک اسی وقت اظہر بھی گھر میں داخل ہوا۔ ابو نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلا لیا۔

"جی ابو!"

"کہاں سے آرہے ہو؟" انہوں نے اس کے سراپا پر بھرپور نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ ابو زاہد کے گھر امتحانوں کی تیاری!!....."

اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ ابو نے ذرا

سخت لہجے میں کہا، "جھوٹ مت بولنا کیوں کہ اس پر پردہ ڈالنے کے لئے مزید جھوٹ گھڑنے پڑیں گے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور نیچے کی طرف دیکھنے لگا پھر چونک کر اوپر دیکھا۔ ابو بھی اس کے پاؤں کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

ابو نے کہا "تمہارے پاؤں پر موجود سیمنٹ کے نشان بتا رہے ہیں کہ تم نے مزدوری کی ہے۔"

وہ اب چھپا نہ سکا "ہاں ابو! یہ ضروری تھا۔"

"کیوں ضروری تھا؟ تمہیں اچھی طرح علم ہے تمہارے امتحان سر پر ہیں اور تم ان فضولیات میں پڑ گئے۔"

"ابو یہ فضولیات نہیں ہیں۔ میرا حق ہے۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا جوش نظر آ رہا تھا۔

"حق!" انہوں نے حیرانی سے کہا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے بیٹا! تم اسے فرائض میں تو شمار کر سکتے ہو کیونکہ اولاد اپنے والدین کے لئے ہی محنت کرتی ہے مگر حق تمہارا یہ نہیں، وہ تعلیم ہے جو ہم تمہیں دینا چاہتے ہیں۔ خواہ حالات کسی بھی قسم کے ہوں۔"

"نہیں ابو! مجھے آپ کی بات سے اتفاق نہیں، میں اسے اپنا حق ہی کہوں گا۔ یہ میرا حق ہے کہ مجھے گھر کے معاملات میں برابر کا شریک ٹھہرایا جائے۔ میں گھر کی ذمہ داریاں اٹھانے میں آپ کی مدد کروں۔ اپنی چھوٹی بہن کو بھوکا نہ سونے دوں اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھوں۔ یہ میرا حق ہے۔" اظہر نے مؤدب مگر ٹھوس لہجے میں کہا۔

"مگر بیٹا تیرے امتحانات میں صرف دس دن رہ گئے ہیں۔" امی نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"ایسا نہیں ہے امی! شہر کے خراب حالات کی وجہ سے امتحانات کینسل ہو گئے ہیں۔ اب امتحانات تک میں کام بھی کروں گا اور پڑھائی بھی کروں گا۔ ابو جب تک آرام کریں گے۔" ابو اور امی بڑی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اپنے بیٹے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

"ہم تم سے تمہارا حق نہیں چھینیں گے۔" ابو نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

تب اظہر کے گلے میں کوئی نمکین سی چیز اترنے لگی۔ شاید یہ اس کے آنسو تھے۔

نوٹ کر لیجئے

دفتر والوں نے ایک چپراسی کی کسی اونچ نیچ پر اسے ملازمت سے علیحدہ کرنے کا نوٹ لکھا اور ڈاکٹر ضیا الدین مرحوم کی منظوری کے لئے بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً متعلقہ شخص کو بلا کر کہا۔ "ایک بات ہمیشہ کے لئے نوٹ کر لیجئے میرے قلم سے لوگ ملازم تو ہو سکتے ہیں، نکالے نہیں جا سکتے"۔

مرسلہ ..... سید عباس علی، کراچی

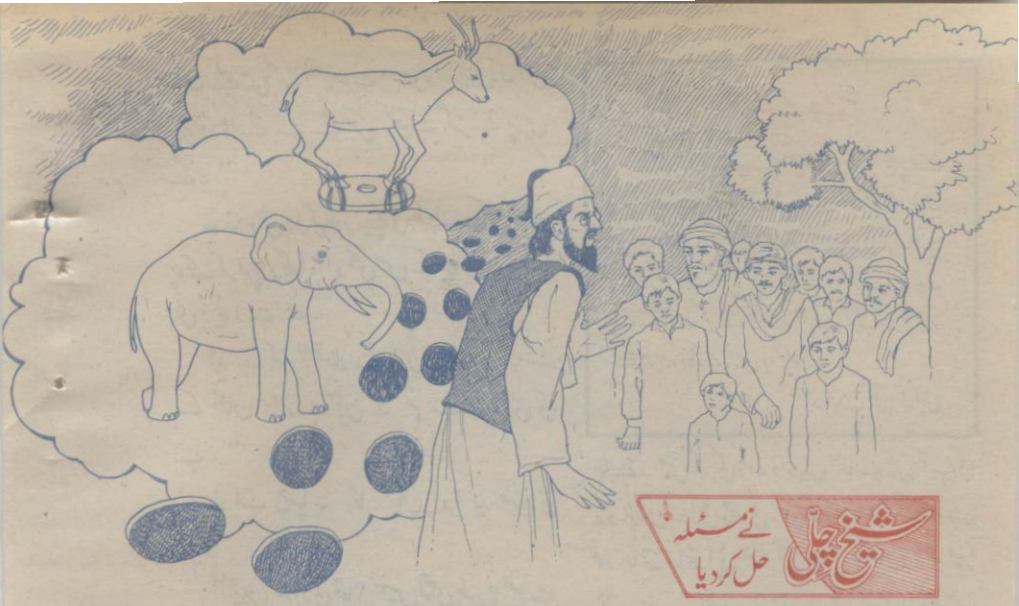

شیخ چلی نے مسئلہ حل کر دیا

عبدالقادر

کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا اک بستی کے لوگوں نے
نہ اس کا نام ہی پہلے سنا کانوں سے لوگوں نے

ہوا پھر اتفاق ایسا کہ بحوِ خواب تھے سارے
فلک کی گود میں تھے جگمگاتے خوش نما تارے

گزر بستی سے ہاتھی کا ہوا پچھلے پہر شب کو
سویرے نقش قدموں کے نظر آئے وہاں سب کو

سبھی حیران تھے بستی میں آخر یہ بلا کیا ہے
زمیں پر یہ نشاں کیسے ہیں ان کا ماجرا کیا ہے

بلایا شیخ چلی کو سمجھ میں جب نہیں آیا
وہ آئے اور نشاں دیکھے، ذرا سا غور فرمایا

کہا پھر شیخ چلی نے کہ تم سب لوگ ہو ناداں
تمہارے بس سے باہر ہے، پہیلی یہ نہیں آساں

معمّہ حل نہیں ہوگا کبھی تم بے وقوفوں سے
بھری ہے پوری بستی ہائے کیسے خر دماغوں سے!

کوئی میرے سوا اس راز کو پا ہی نہیں سکتا
پہنچ ہے جس جگہ میری، وہاں جا ہی نہیں سکتا

بڑی پیچیدہ گتھی ہے اسے سلجھاؤں گا میں ہی
بلایا ہے مجھے تم نے تو پھر سمجھاؤں گا میں ہی

ہمیشہ ذہن کی الجھن کو میں نے ہی مٹایا ہے
ہرن کی یہ شرارت ہے، پتہ میں نے لگایا ہے

کہیں سے پاٹ چکی کا ہرن کو مل گیا لوگو
اسے پیروں سے باندھا اور اچھلتا چل دیا لوگو

نشاں، ہیں گول چکی کے زمیں پر جو نمایاں ہیں
یہی وہ بات ہے جس سے یہاں سارے پریشاں ہیں

بہ خدمت جناب

محمد عادل منہاج، کراچی۔ آزادی کے حوالے سے اگست کا شمارہ ایک اچھی کوشش تھی مگر خصوصی شمارہ کافی دبلا پتلا تھا۔ "ہم ایک ہیں"، "حفاظت"، "امتحان" اور "مجو کی پتنگ" نسبتاً نئے انداز کی تحریریں تھیں۔ "بونا اور دیو"، "آچھیں" اور "گھوڑا" نامی مضامین کی جگہ پاکستان اور آزادی سے متعلق مضامین کو جگہ دی جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ جاوید عبدالکریم سحر، کراچی۔ اگست کا شمارہ چوں کہ "خصوصی شمارہ" تھا اس لئے اسے عام شماروں کی نسبت ضخیم ہونا چاہئے تھا۔ خیر ضخامت قیمت میں نظر آئی۔ ○ ـــــ بھائی جاوید! اگست کا شمارہ "خاص نمبر" نہیں تھا، خصوصی شمارہ تھا اس لئے اس کی ضخامت میں بہت زیادہ اضافہ نہیں کیا گیا اور چوں کہ ساتھیوں کو دس روپے والے بیج کا تحفہ بھی دینا تھا اس لئے مجبوراً قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔ محمد اختر سردار، ساہیوال۔ اگست کا شمارہ پڑھا، بے حد پسند آیا۔ آپ میری تحریریں کیوں نہیں چھاپتے۔ ○ ـــــ یہی شکایت تو ہمیں بھی ہے کہ آپ کی تحریریں کیوں نہیں چھپتیں۔ آپ اچھا لکھا کیجئے ناں! مکمل شاعر، پسنی (مکران)۔ اگست کا شمارہ بے حد اچھا لگا۔ آپ نے میری تحریر کو آنکھ مچولی میں جگہ دی۔ شکریہ! محمد ممتاز الدین، کراچی۔ اگست کا شمارہ خوب صورت بیج کے ساتھ ملا۔ بے حد اچھا لگا۔ ملا رواں کی پہلی بات، "قومی اتحاد"، "یقین کی دولت" اور "کشمیر کا میانداد" بے حد پسند آئیں۔ عدیل احمد، ناظم آباد (کراچی)۔ خصوصی شمارے میں "بونا اور دیو"، "امتحان" اور "بچھو" نے متاثر کیا۔ بیج کا خوب صورت تحفہ بے حد پسند آیا۔ دانش راٹھور، میرپور خاص۔ اگست کا شمارہ خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ ملا۔ بے حد پسند آیا۔ صائمہ ارم، واہ کینٹ۔ "ایک خط ایک مسئلہ" میں بتایا گیا ہے کہ مغربی بے ہنگم موسیقی ہماری تہذیب و ثقافت کے لئے خطرہ ہے۔ میں ارم رؤف

کے اس خیال سے اتفاق کرتی ہوں۔ قاسم بن نظر، کراچی۔ آزادی پر خصوصی شمارہ بیچ کے خوبصورت تحفے کے ساتھ بے حد اچھا لگا۔ عافیہ سعید سحر، چکوال۔ آنکھ مچولی میں اپنی "حمد" چھپی دیکھی تو آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بے حد شکریہ۔ انکل! کچھ تجاویز ارسال کر رہی ہوں۔ ○ ..... آپ کی تجاویز اچھی ہیں۔ اس پر ضرور غور کریں گے۔ اشفاق احمد ناز، کراچی۔ اگست کا خصوصی خوبصورت شمارہ پہلی تاریخ ہی کو مل گیا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ گلگلے مزیدار تھے۔ رضوان احمد خان، بھکر۔ "سزا" اور "صحت ہزار نعمت ہے" کے عنوان سے دو تحریریں ارسال کی تھیں لیکن آپ نے کوئی جواب ہی نہیں دیا ○ ..... بھائی رضوان! آپ کی دونوں تحریریں ناقابل اشاعت ہیں لیکن آپ مایوس نہ ہوں کوئی اور مختصر، معیاری اور دلچسپ تحریر بھیجئے۔ جہانزیب احمد، حیدر آباد۔ "مزید محنت کی ضرورت ہے" سے کیا مراد ہے؟ ○ ..... "ناقابل اشاعت" لیکن اس سے مراد یہ بھی ہے کہ مایوس ہونے کے بجائے جلدی سے کوئی اور دلچسپ مختصر تحریر بھیج دیجئے!! احمد عمران، پشاور۔ اگست کا ٹائٹیل بہت خوبصورت تھا۔ میری طرف سے اتنا اچھا ٹائٹیل بنانے پر آرٹسٹ صاحب کو بہت مبارک باد۔ ○ ..... آپ کی مبارک باد آرٹسٹ صاحب نے وصول کر لی ہے اور وہ آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ سلمان احمد، کھاریاں۔ محمد ضیاء الحق راٹھور، میر پور خاص۔ عامر ظفر، عمیر ظفر، ثوبیہ ظفر، لاہور کینٹ۔ یوم آزادی کے حوالے سے اگست کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ سرورق لاجواب تھا اور بیچ کا تحفہ تو بہت پسند آیا۔ وقاص خواجہ، لاہور کینٹ۔ اگست کے شمارے میں "یقین کی دولت" "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے" اور "حفاظت" بہترین کہانیاں تھیں۔ تنزیل الرحمٰن احمد، ثمرہ شہزادی، گوندلا۔ آپ کے دیئے ہوئے بیج نے ۱۴ اگست کو والہانہ طریقے سے منانے کی یاد تازہ کر دی ہے۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ (سندھ) اگست کے شمارے میں تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ اس بار کسی کھلاڑی کا انٹرویو نہیں تھا۔ باسط علی، میانداد، سعید انور اور عامر سہیل کے انٹرویو کا انتظار ہے۔ محمد تخلیم قریشی، اسلام آباد۔ اگست کا سرورق پچھلے تمام سرورقوں کو پیچھے چھوڑ گیا لیکن خصوصی شمارے کے صفحات صرف ۱۴۶ تھے اور قیمت آپ نے ۱۵ روپے رکھی جس سے لاکھوں پر اوس پڑ گئی۔ محمد یونس حسین، کراچی۔ آپ بلا عنوان کہانی کا انعامی سلسلہ شروع کریں جس کا عنوان بچے منتخب کریں۔ کاشف ریاض، لاہور اگست کے خصوصی شمارے کی ساری ہی تحریریں اچھی بلکہ بہت ہی اچھی تھیں۔ محمد ندیم شیخ، نوابشاہ۔ خصوصی شمارے کے ساتھ پیارے سے بیج کا تحفہ پسند آیا۔ منصور احمد سومرو، گڈو (سندھ) اگست کے شمارے میں حضرت موسیٰؑ اور حضرؑ کا قصہ اچھا تھا۔ اعجاز احمد ضیا کالیکی منڈی (پنجاب) خصوصی شمارے میں علی اکمل، جاوید خالد، ادریس قریشی اور عادل منہاج کی کہانیاں لاجواب تھیں۔ رؤف نیاز، دیپال پور۔ ایک عظیم شاعر ایک عظیم مجلہ" اور "ہم ایک ہیں" بہت پسند آئیں۔ پہلی دفعہ میں ہی آنکھ مچولی کا گرویدہ ہو گیا ہوں۔ سید نیر آفاق سبزواری، راولپنڈی۔ جولائی کا شمارہ نظروں سے گزرا، پسند آیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ صفحات ۱۵۰ سے گھٹ کر ۱۴۰ اور اس سے بھی گھٹ کر اب ۱۳۰ پر آ گئے ہیں۔ کیوں؟ ○ ..... لیکن آپ یہ نے یہ غور نہیں کیا کہ رنگین صفحات زیادہ ہو گئے ہیں۔ فہیم عزیز، لانڈھی (کراچی) ایک عدد معلوماتی تحریر کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں۔ میری پچھلی تحریروں کا کیا بنا؟ ○ ..... اس ماہ کا قلم قبیلے دیکھ کر امید ہے شکایت دور ہو جائے گی۔ فلذا فرحین رضا، کراچی۔ جولائی کا شمارہ بے حد اچھا لگا۔ ایک نظم "اللہ تیرا نام" بھیج رہی ہوں۔ ○ ..... آپ کی نظم قلم قبیلے میں باری آنے پر چھپ جائے گی۔ عاطف محبوب، لاہور۔ "خبریں سارے جہان کی" اس نام سے ایک فیچر تصاویر کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔ کیا شائع ہو جائے گا؟ ○ ..... بھئی کچھ اپنے جہاں کی خبریں لائیے۔ اس کے لئے تو معذرت! محمد آصف، کندیاں (میانوالی) انکل! کندیاں میں آنکھ مچولی

ایک خط ایک مسئلہ

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

اس خط کے ذریعے آپ کی، ساتھیوں اور اپنے بڑوں کی توجہ ایک اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ مسئلہ ہے قومی لباس (شلوار قمیض) نہ پہننے کا۔ ہمارے بزرگ اور اساتذہ پاکستانی بننے اور پاکستانی چیزوں کے استعمال کا مشورہ تو دیتے ہیں لیکن وہ اور نوجوان نسل تقاریب اور محفلوں میں غیر ملکی لباس پینٹ شرٹ اور سوٹ پہنتی ہے حتیٰ کہ قومی تقریبات "جشن آزادی" "پیدائش قائداعظم" اور "علامہ اقبال" کے قومی دن پر بھی مہمانِ خصوصی سے لے کر حاضرین کی اکثریت غیر ملکی لباسوں میں ملبوس نظر آتی ہے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے لیکن اکثریت انگلش فرفر بولنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ دوسری زبانیں سیکھنا اچھی بات ہے لیکن دوسروں کی چیزوں پر اترانا اور فخر کرنا اپنی روایات، اپنی تہذیب اور اپنی شناخت کا گلا گھونٹنا ہے۔

بے شک پاکستان تو آزاد ہو گیا ہے لیکن ہم لوگ ذہنی طور پر ابھی تک غیر ملکی اقوام کے غلام ہیں۔ اگر ہمارے "بڑے" پاکستانی نہیں بنتے تو کم از کم نوجوان نسل کو اپنی زبان، اپنے لباس اور اپنی تہذیب کو اپنانا چاہئے۔ بڑوں نے پاکستانی روایات بھلا دیں تو وہ الگ مسئلہ ہے لیکن نوجوان نسل نے اپنے اسلاف کے کارنامے بھلا دیئے اور اپنی روایات کو فراموش کر دیا تو بحیثیت "پاکستانی قوم" ایک دن ہماری شناخت ختم ہو جائے گی۔

محمد اسحاق وردگ، پشاور شہر

نہیں آتا۔ مجھے میانوالی جا کر خریدنا پڑتا ہے برائے مہربانی کندیاں میں آنکھ مچولی ضرور بھیجا کریں۔ ○ ..... پیارے بھائی! اگر وہاں کتابوں، رسالوں کی کوئی ایجنسی ہے تو ان سے کہیں کہ ہم سے رابطہ کریں۔ زینب، راحیل، طارق، عمر، نومان، عبداللہ (؟) ماجد خان حیدر آباد۔ جس طرح آپ نے محترم ڈاکٹر عبدالقدیر خان، شعیب محمد، راشد لطیف اور چچا چونچ کے انٹرویوز شائع کئے اسی طرح اب آپ اسٹار بینسمین جاوید میاں داد اور انضمام الحق کا انٹرویو چھاپیں۔ ○ ..... چھاپیں گے بھئی ضرور چھاپیں گے۔ دھواں دھار بیٹنگ کرنے والے کھلاڑی تو ہمیں بھی پسند ہیں۔ محمد خالد، نصیر پور۔ میری نظموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ○ ..... لالچ واقعی بری بلا ہے اور "بارش کے بعد" بارش آنے پر سوری بادی آنے پر قلم تکیے میں چھپ جائے گی۔ غزالہ صدیقی، کراچی۔ انکل۔ آپ نے بہت سے اچھوتے نمبر نکالے ہیں۔ اب آپ "بڑھاپا نمبر" نکالیں تاکہ ہم بزرگوں کے خیالات اور ان کے بڑھاپے کے بارے میں پڑھ سکیں۔ ○ ..... بھئی ابھی ہم بوڑھے نہیں ہوئے جب ہو جائیں گے تو ضرور آپ کی فرمائش پوری کریں گے۔ سرج الحق، مارگلہ ٹاؤن (سوات) آنکھ مچولی ہر لحاظ سے بچوں کی اخلاقی، مذہبی اور علمی تربیت کر رہا ہے۔ کیا میں آنکھ مچولی کی محفل میں شرکت کر سکتا ہوں ○ ..... بالکل جناب۔ پخیر راغلے۔ سمیع اللہ، کراچی۔ پہلی مرتبہ شریک ہو رہا ہوں کیا آپ میرا خط شائع کریں گے؟ خوش آمدید بھائی! محمد اسماعیل سرسانہ، ملتان۔ انکل! کیا آپ کو میری بھیجی ہوئی معلومات مل گئی ہیں؟ ○ ..... کون سی معلومات؟ عائشہ عمر، پشاور۔ اگر میں ایک کہانی بھیجوں تو شائع کریں گے؟ ○ ..... بھئی کہانی پڑھنے سے پہلے وعدہ کیسے کر لیں۔ فخرالدین ظفر، کنری (تھرپارکر) انکل! آپ رسالے میں لکھتے ہیں کہ یہ آپ ہی کا

رسالہ ہے اور ادھر آپ ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتے...... !! ○ ...... بھئی! لفٹ تو ہم سب ہی کو کراتے ہیں۔ آپ کی معلومات باری آنے پر قلم قتلے میں چھپ جائیں گی۔ **عثمان بن سلیم، کراچی۔** پرچے پر تبصرہ کرنے کا قطعی دل نہیں چاہ رہا۔ اس بات کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں۔ میری پچھلی تحریروں کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا...... !! ○ ...... بھائی عثمان! آپ کی ایک تحریر "تحفہ" اصلاح کے بعد تازہ شمارے میں شامل ہے۔ **پرنس غلام شبیر وسیم، مخدوم پور۔** آپ کے پیارے رسالے میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں کیا آپ ...... ○ ...... جی ہاں بالکل! **قیصر نوید، کھاریاں۔** جولائی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ **چوہدری سجاد حسین، لاہور۔** میں آپ کو دو ڈاک ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ کوئی اچھی سی کتاب ارسال کر دیجئے۔ ○ ...... بھائی سجاد! ہمیں کوئی ڈاک ٹکٹ نہیں ملے۔ **فاروق اعظم، رابعہ اعظم، حسیب انور، احمد پور شرقیہ۔** ہمارا خط ضرور شائع کریں ورنہ ...... ○ ...... بھئی! اچھے بچے دھمکیاں نہیں دیتے۔ **صوفیہ رحمان، تخت بھائی۔** ایک کہانی اور کچھ معلومات ارسال کر رہی ہوں۔ رائے سے آگاہ فرمائیں۔ **فاروق احمد پاشا، جامپور۔** پہلی بار آنکھ مچولی پڑھا بہت اچھا لگا۔ **محمد شفیق، قصور۔** میری لکھائی اچھی نہیں اس لئے ڈر ڈر کر خط لکھ رہا ہوں ○ ...... شکر ہے کہ آپ نے ہماری لکھائی نہیں دیکھی۔ **طٰسین خان نیازی، فیصل آباد۔** آپ بوجھو تو جانیں کی جگہ سائنسی سوالات کا انعامی مقابلہ شروع کریں اور "کم از کم" تیس پینتیس انعامات ساتھیوں کو دیئے جائیں۔ ○ ...... کیا کیا؟ تیس پینتیس۔ لیجئے بھئی ہم تو بے ہوش ہو رہے ہیں۔ **نادیہ سحر، لاہور۔** آنکھ مچولی میں ایک مسکراتی ہوئی تحریر بھیج رہی ہوں۔ یہ میری پہلی کوشش ہے ○ ...... آپ کی پہلی تحریر ہمارے پاس پہنچ کر رو پڑی ہے اس لئے اب آپ دوسری کوشش کیجئے۔ **کامران بنارس، آزاد کشمیر۔** مجھے آنکھ مچولی بے حد پسند ہے۔ آپ نے اس میں میرا لطیفہ شائع نہ کیا تو ناراض ہو جاؤں گا۔ ○ .... نہ نہ بھائی! اچھے بچے ناراض نہیں ہوتے۔ آپ کا لطیفہ گلگلے میں شامل ہے۔ **سیما عقیل راجپوت، حیدر آباد۔** جولائی کے شمارے میں تصویر آزادی کے مقابلے کا کوپن "ایک خوش نصیب صحابی" کے پیچھے شائع کیا گیا۔ مضمون میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک تحریر ہے۔ میں اس کوپن کو نہیں کاٹ سکتی اس وجہ سے مقابلے میں حصہ نہیں لے رہی ہوں۔ ○ .... ہمیں افسوس ہے کہ ہماری کوتاہی کی وجہ سے آپ تصویری مقابلے میں شامل نہ ہو سکیں۔ آئندہ ہم پوری احتیاط کریں گے۔ **بینش نثار، راولپنڈی۔** لطیفوں کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اشتہارات زیادہ شامل ہونے لگے ہیں۔ اگر میں کسی کرکٹر پر کوئی مضمون بھیجوں تو کیا وہ چھپ جائے گا؟ ○ .... آپ کی شکایات نوٹ کر لی ہیں۔ کہانی یا مضمون بھیجتے ہوئے پوچھا نہ کیجئے بس بھیج دیا کیجئے۔ **سہام رفیق، چاچڑاں شریف۔** پورے ملک میں اپنی نوعیت کا سب سے اچھا اور بچوں کا سب سے پیارا رسالہ "آنکھ مچولی ہے۔" جولائی کے شمارے قلم قتلے سیکشن میں "تحفہ" "گمنام مجاہد" اور "جسے اللہ رکھے" بے حد پسند آئیں۔ **سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔** آپ نے میرے لطائف شائع نہیں کئے حالاں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اپریل میں چھاپ دیں گے۔ ○ ...... بھائی! واقعی بھول چوک ہو گئی۔ اس شمارے میں آپ کے لطائف شامل ہیں۔ **عمران خان یوسف زئی (؟)** آنکھ مچولی نے جب کئی بار نظر انداز کیا تو میں نے خط لکھنا چھوڑ دیا لیکن رسالہ پڑھنا نہیں چھوڑا۔ اب پھر خط لکھ رہا ہوں۔ ○ .... آپ کو آنکھ مچولی سے واقعی محبت ہے۔ **لبنیٰ سعدیہ، عزیز آباد (کراچی)** آنکھ مچولی نے میری تحریریں شائع کیں۔ بہت شکریہ۔ اس دفعہ رسالہ پڑھنے میں صرف آدھا گھنٹہ لگا کیوں کہ آپ نے صفحات جو کم کر دیئے ہیں۔ **اعجاز حسین پٹھان، عمر کوٹ۔** میں شدید بیمار تھا جس کی وجہ سے آنکھ مچولی کا مطالعہ نہ کر سکا۔ آپ نے میری کوئی ○ .... آپ کی نظم شامل ہے۔ ہماری دعا ہے کہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔

کیسی رہی

رضوانہ سید علی

بات تو کافی پرانی ہے مگر ذہن میں یوں تازہ ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ہم لوگ چھت پر کھیل رہے تھے کہ میرے چھوٹے بھائی ارشد نے آکر اعلان کیا "نئے پڑوسیوں کا سامان آرہا ہے۔"

ہم اشتیاق سے گلی میں جھانکنے لگے کہ دیکھیں آنے والوں کے ساتھ بچے بھی ہیں یا نہیں۔ سامان کے چھکڑے پر دو لڑکے بھی سوار تھے۔ ان میں ایک بڑے بھائی کی عمر کا تھا اور دوسرا ارشد کا ہم عمر نظر آرہا تھا۔ ایک ٹیکسی پہلے ہی آکر رک چکی تھی۔ اس میں سے کئی برقعہ پوش خواتین باہر نکلیں مگر ان میں کوئی بچی نہ تھی۔

مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ البتہ بھائی جان اور ارشد خاصے خوش نظر آرہے تھے۔

ہمارے پڑوس کا مکان کافی مدّت سے خالی پڑا تھا۔ پہلے رہنے والے ہمسایوں کے بچے ہم عمر تھے۔ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں ہم سب اپنی امّی کے سونے کے بعد چپکے سے کھسک لیتے اور چھت پر گھنٹوں مل کر کھیلتے رہتے۔ بہت مزہ آتا تھا۔ افسوس کہ ان کے ابّو کا کسی اور شہر میں تبادلہ ہو گیا اور ہم اچھّے دوستوں سے محروم ہو گئے۔

اس کے بعد اس مکان میں کئی لوگ آئے اور گئے مگر معلوم نہیں کیوں زیادہ عرصہ کوئی نہ ٹِک سکا۔ یوں ہمارا پڑوس اکثر غیر آباد ہی رہتا۔ آج پھر نئے پڑوسی آرہے تھے۔ ہم نے نیچے اتر کر امّی کو خوش خبری سنائی۔ وہ خوش ہو کر بولیں۔ "چلو اچھّا ہے۔ پڑوس آباد رہے تو رونق رہتی ہے۔" اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ارشد نے دروازہ کھولا تو ہمارا نیا پڑوسی لڑکا ہاتھ میں ایک ڈبّا لئے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بے دھڑک اندر داخل ہوا اور سیدھا امّی کے پاس پہنچا۔ سلام کے بعد کہنے لگا "آنٹی ہمارا سامان بند پڑا ہے۔ ایک ڈبّا آٹا تو دے دیں۔ امّی کہنے لگیں "بیٹا میں کھانا بنا کر بھیج دیتی ہوں"۔

بولا "نہیں آنٹی! بس آٹا ہی دے دیں۔" امی نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور آٹا دے دیا۔ نیا پڑوسی بے نیازی سے ہمیں دیکھتا ہوا چلا گیا۔ ہم پر بھی کوئی اچھّا تاثر نہیں پڑا۔ آتے ہی آٹا مانگنے آجانا کوئی بہت اچھّی بات نہیں تھی اور ہمارا خدشہ کوئی بے جا نہ تھا۔ شام تک پڑوسی بچّے چھُری، آلو، نمک، چائے کی پتّی، صبح کا اخبار اور پچیس جیسی بہترین چیزیں مانگنے آئے۔ واقعی اگر امّی ایک دفعہ ہی کھانا بنا کر بھیج دیتیں تو بہتر رہتا۔

پھر تو جناب صبح سویرے مخصوص دستک سنتے ہی ہم سمجھ جاتے کہ ہمارے پڑوسی ہم سے پہلے خود تازہ اخبار پڑھنا چاہتے ہیں۔ کبھی اچانک ان کا دودھ خراب ہو جاتا اور کبھی آٹا ختم ہو جاتا۔ عابد اور اسلام پڑھنے بیٹھتے تو انہیں پتہ چلتا کہ سیاہی ختم ہے یا ربڑ اور پنسل نہیں ہے اور وہ بلا تکلّف بھائی جان یا ارشد کی چیزیں اٹھا لے جاتے۔ ان کی بڑی بہنوں کو کہیں جانا ہوتا تو امّی کی چپل اور سوٹ سے ملتے جلتے دوپٹے کا مطالبہ ہو جاتا۔

ایک روز محلّے کے کسی گھر میں میلاد ہوا۔ اتفاقاً اس روز نئے پڑوسی اپنے کسی رشتے دار کے گھر گئے ہوئے تھے۔ اس محفل میں پتہ چلا کہ محلّے کا کوئی گھر بھی ان کی دست بُرد سے محفوظ نہیں۔ کسی سے سلائی مشین تو کسی سے استری مانگی جاتی ہے۔ آٹا، ماچسیں، پیاز، لہسن اور چائے چینی وغیرہ تو تقریباً سبھی گھروں سے جاتی تھیں۔ سب حیران تھے کہ کیسے لوگ ہیں۔ کبھی کبھار تو خیر پڑوسی ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مانگ ہی لیتے ہیں اور ہمسایوں کی مدد کرنا اخلاقی فرض بھی ہے مگر اتنے تواتر کے ساتھ دوسروں کے سامنے ہاتھ

پھیلانا تو ڈھٹائی ہے۔

بمشکل ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ بی پڑوسن کے نئے رنگ ڈھنگ بھی سامنے آنے لگے۔ ہماری امی کو انہوں نے کئی ایسی خبریں سنائیں جو عرصے سے وہاں رہنے کے باوجود امی کو معلوم نہ تھیں۔ مگر بی پڑوسن سب کے کچے چٹھے جان چکی تھیں۔ ہماری امی ایسی باتیں سن کر مروتاً خاموش رہتیں۔ ویسے بھی وہ خبریں آگے پہنچانے کا ہُنر نہیں جانتی تھیں مگر ایک روز محلّے میں کہرام برپا ہو ہی گیا۔ معلوم ہوا کہ ہماری پڑوسن نے دو گھروں کے بچوں کے بارے میں اوٹ پٹانگ باتیں ایک دوسرے کی ماؤں سے کہیں تھیں۔ دونوں خواتین پہلے تو ایک دوسرے سے لڑنے پہنچی مگر جونہی ان پر حقیقت واضح ہوئی تو وہ عابد اور اسلام کے گھر چڑھ دوڑیں مگر عابد اور اسلام کی امی صاف مُکر گئیں اور دونوں خواتین سر پیٹ کر رہ گئیں۔

اس کے بعد تو ہمارے محلّے کا سکون ہی غارت ہو گیا۔ کئی لڑائیوں میں تو پولیس تھانے کی نوبت آ گئی۔ ہر لڑائی کے پیچھے کسی نہ کسی طور عابد اور اسلام کی امی یعنی ہماری نئی پڑوسن کا ہاتھ ضرور نکلتا۔ آخر کچھ دن بعد ہی جب ان کی اصلیت سب پر واضح ہو گئی تو پورے محلّے نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔

لیکن ہمارے گھرانے کے ساتھ ابھی ان کے تعلقات کسی نہ کسی طور نبھ ہی رہے تھے۔ ایک تو وہی بات کہ امی ان کی لگائی بجھائی کو خاموشی سے پی جاتی تھیں۔ دوسرے ہر وہ چیز جو مانگی جاتی جو امی دینے سے انکار نہ کرتی تھیں۔ حالانکہ ہم لوگ بے حد کڑھتے تھے۔

لیکن آخر کب تک؟ ایک دن ہماری شامت بھی آ ہی گئی۔ ہوا یوں کہ اتفاق سے صبح صبح ہماری استری جل گئی، چھٹی کا دن تھا۔ کوئی دس بجے کے قریب اسلام استری مانگنے آیا۔ دروازہ میں نے کھولا اور وہیں بتا دیا کہ ہماری اِستری خراب ہے۔ وہ بے یقینی سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ دوپہر کو ارشد گھر سے باہر نکلا تو عابد نے اسے دھکا دے کر ایسا گرایا کہ اس کا ہونٹ پھٹ گیا اور وہ روتا ہوا گھر آ گیا۔ امی نے کہا جاؤ اس کی امی سے شکایت کرو۔ یہ شکایت تو بس غضب ڈھا گئی۔ پڑوسن صحن میں کھڑی ہو کر دھاڑتے ہوئے کہنے لگیں کہ "میرے معصوم بچّے پر الزام لگانے والوں کو خدا غارت کرے۔ اپنے بچّے تو جیسے فرشتے ہیں، ارے بھولی صورتوں سے کیا ہوتا ہے، ان کے پیچھے ہی شیطان چھپے ہوتے ہیں۔"

امی کو تو سمجھ ہی میں نہیں آئی کہ کِسے ملاحیاں سنائی جا رہی ہیں۔ ارشد منہ لٹکائے گھر میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ یہ سب کچھ ہمیں سُنایا جا رہا ہے تو حیران پریشان رہ گئیں۔ اس کے بعد تو ہم لوگوں کا جینا دشوار ہو گیا۔ باہر نکلتے تو عابد اور اسلام ہمارا منہ چڑاتے اور پتھر پھینکتے اور روز کوئی نہ کوئی پڑوسن آ کر بتاتی کہ آج عابد کی امی نے کیا گُل افشانی کی ہے۔ انہوں نے ہمارے بارے میں

ایسی ایسی خبریں اڑائیں کہ امّی کے تو ہوش اڑے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ شام کو جب ہم اپنے صحن میں بیٹھتے تو ساتھ ہی پڑوس سے کوسنوں اور بد دعاؤں کی صدائیں آنے لگتی۔ مغرب کی اذان کے ساتھ تو یہ کوسنے اور بد دعائیں پورے محلے کے لئے اس قدر گڑگڑا کر اور خشوع و خضوع کے ساتھ دی جاتیں کہ ایک روز ان کے گھر کے دوسری طرف رہنے والی پڑوسن سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ آستین چڑھا کر ان کے گھر میں کود پڑی۔ وہ غدر مچا کہ الامان و الحفیظ۔

امّی ہر وقت پریشان رہنے لگیں۔ سارا محلّہ ہی بیزار تھا۔ امن و سکون اور سُکھ چین سب غارت ہو چکا تھا۔ ایک روز دوپہر کو جب امّی قیلولہ کر رہی تھیں، ہم حسبِ معمول اپنے رسالے کتابیں اور کھیل کھلونے لے کر چھت پر کھسک گئے۔ میں اور بھائی جان نئے رسالے چاٹنے میں مصروف تھے۔ ارشد اکیلا ہی لوڈو کھیل رہا تھا اچانک اسے سیما، ہما اور انور یاد آ گئے۔

"باجی جب وہ سب پڑوس میں تھے تو کتنا مزہ آتا تھا اور اب؟"

"رضوانہ!" بھائی جان اچانک یوں اُچھلے جیسے بچھّو نے کاٹا ہو۔

"کیا ہوا بھائی جان؟" میرے ہاتھ سے بھی رسالہ گر گیا۔

"یہ دیکھو۔"

"کیا؟" میں بے تابی سے آگے جھکی۔

بھائی جان کے ہاتھ میں ماہنامہ کھلونا کا تازہ شمارہ تھا۔ یہ رسالہ دہلی سے چھپتا تھا اور بچوں میں بے حد مقبول تھا۔

"بھئی کیا شاندار کہانی ہے۔" بھائی جان نے جھوم کر کہا۔

"لائیے دکھائیے۔" میں نے رسالہ ہاتھ میں لینا چاہا۔

"نہیں بس سُن لو۔" بھائی جان نے رسالے والا ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ایک مرتبہ رسالہ میرے ہاتھ میں آیا تو پھر گیا کیونکہ کھلونا دہلی ہم لوگوں کا پسندیدہ رسالہ تھا۔ ویسے بھی پاکستان میں کم آتا تھا اور بمشکل ملتا تھا۔

"اچھا! سنائیے"۔ میں نے مایوس ہو کر ہاتھ نیچے کر لیا۔

"یہ ایک لڑکی بیلا کی کہانی ہے۔ وہ یتیم تھی۔ اس کے ابّو نے ایک مکان ورثے میں چھوڑا تھا جو بیلا کی امّی نے کرائے پر چڑھا رکھا تھا اور اسی آمدن سے دونوں ماں بیٹی گزر بسر کرتی تھیں مگر ان کے کرائے دار سخت بے ایمان نکلے۔ انہوں نے کرایہ دینا بند کر دیا اور مکان پر قبضہ جما کر مزے سے رہنے لگے۔ بیلا نے اپنی گہری سہیلی سے اس پریشانی کا ذکر کیا تو سہیلی اور اس کا بھائی بیلا کی مدد کو تیار ہو گئے۔ بیلا کے بھائی نے سادھو کا روپ دھارا اور کرائے داروں کے ہاں پہنچ کر مکان پر ٹوٹنے والی بھیانک مصیبتوں کی پیش گوئی کی۔

اگلے روز سے ہی بیلا کی ماں نے کرائے داروں کو ڈرانے کے لئے کبھی ان کے گھر میں بکرے کے خون کے چھینٹے پھینکنے شروع کئے تو کبھی بکرے کے دل میں سوئیاں چبھو کر ان کی دہلیز پر پھینک دیا۔ یہ سب کچھ وہ بیلا کی سہیلی کے بھائی سریش کی بنائی ہوئی اسکیم کے مطابق کر رہی تھیں۔

ایک ہفتے کے اندر اندر تو ہم پرست کرائے دار ڈر کر مکان خالی کر گئے۔"

"نہ تو اس میں ایسی شاندار چیز کیا ہے جس نے آپ کو چھلانگیں لگانے پر مجبور کر دیا؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"آئیڈیا میری بہن! ناپسندیدہ لوگوں سے چھٹکارا پانے کا آئیڈیا۔"

"مگر ہمارا تو ایسا کوئی مکان نہیں جس میں کرائے دار رہتے ہوں"۔ ارشد بھولپن سے بولا۔ "بھئی پڑوسن تو ہیں جنہوں نے سب کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ مکان ہمارا نہیں تو کیا ہوا؟" میں نے اسے سمجھایا۔

اور پھر ہم سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ کس طرح ان پڑوسیوں کو خوف زدہ کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ ڈر بھی تھا کہ اگر امی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو مار مار کر ہمیں گنجا ہی کر دیں گی۔ لہٰذا ہر کام مکمل راز داری سے ہونا چاہئے۔

بھائی جان ہم سے سینئر بھی تھے اور ان کی معلومات بھی ہم سے زیادہ تھیں۔ انہوں نے ہمیں قائل کر لیا کہ سب سے پہلے پڑوسیوں کے

کیا آپ جانتے ہیں!

- ..... ہاتھی کے پاؤں میں ناخن نہیں ہوتے۔
- ..... ہاتھی کے ایک کان کا وزن ½ ا من ہوتا ہے۔
- ..... انسان کے بعد ذہین ترین مخلوق مکڑی ہے۔
- ..... جمائی آکسیجن کی کمی کی وجہ سے آتی ہے۔
- ..... عورت کی نسبت مرد پہلے بوڑھے ہوتے ہیں۔

مشہور کردار اور خالق

کردار	خالق
ٹارزن	ایڈگر رائس بروس
جیمز بانڈ	آئن فلیمنگ
شرلاک ہومز	آرتھر کانن ڈائل
حاتم طائی	حیدر علی جوش
رستم و سہراب	فردوسی طوسی
چچا چھکن	امتیاز علی تاج
امراؤ جان ادا	مرزا ہادی رسوا
ڈریکولا	بریم اسٹوکر

(مرسلہ..... کرن نوشین عارف، ملتان)

گھر میں تعویز پھینکنے چاہئیں۔ کئی دن کی کاوشوں کے بعد بھائی جان نے کچھ مختلف ڈراؤنی شکلوں کے تعویز تیار کئے۔

اس قسم کے تعویز انہوں نے کسی مولوی صاحب کو بناتے دیکھا تھا۔ زیادہ ڈراؤنا بنانے کے لئے کھوپڑی کا اضافہ خود ہی کر لیا تھا۔ ساتھ ہی کوشش کی تھی کہ خانوں میں ایسے حروف لکھے جائیں جن سے پڑوس کے کسی نہ کسی فرد کا نام ضرور بنتا ہو۔

آخر ایک روز دوپہر کو ہم اوپر چڑھے۔ خوف سے خود ہمارے دل بھی دھڑک رہے تھے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ خود ساختہ تعویز سفید کپڑے کی دھجی میں باندھ کر ہم نے پڑوس کے صحن میں اُچھال دیئے اور چُپکے سے نیچے اتر آئے۔ عصر تک وہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس کی ہمیں توقع تھی۔ پڑوسن تعویز پھینکنے والوں کو نئے نئے کوسنے اور بددعائیں دے رہی تھیں جو شاید انہوں نے آج ہی ایجاد کی تھیں۔

شام تک تھک تھکا کر چپ ہو رہیں کیونکہ اب محلے میں ان کی بک بک پر کوئی کان ہی نہیں دھرتا تھا۔ تین چار روز ہم دم سادھے رہے۔ پانچویں دن امی کے سونے کی بعد ہم نے وہ کالے ماش نکالے جو بھائی جان بازار سے لائے تھے اور پڑوس کے صحن میں اُچھال دیئے۔ اس روز خلاف توقع کوئی خاص غلغلہ نہ مچا مگر بھائی جان نے ہمیں تاکید کی کہ اب کوئی چھت پر نہ چڑھے۔ پڑوسی انتہائی عیّار ہیں اور ضرور تاک لگا کر اپنے مجرم کو پکڑنے کی دُھن میں ہوں گے۔ اسی لئے ان کا ٹیپ ریکارڈ یعنی اماں جان بالکل خاموش ہیں۔

ایک ہفتہ ہم نے نہایت صبر سے گزارا پھر بھائی جان کی ہدایت پر میں نے ایک بھدّی سی گڑیا بنائی اور اس کے جسم میں ڈھیر ساری سوئیاں چبھو دیں، بھائی جان باہر نکلے۔ یہ پُتلا انہوں نے پڑوسیوں کی چوکھٹ پر رکھا۔ بیل بجائی اور چُپکے سے کھسک لئے۔ دروازہ شاید سلام کی باجی نے کھولا وہ تو دروازے پر ہی بین کرنے لگی۔

اس کی بکرے جیسی آواز سن کر بہت سے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ وہ پورے محلے کو گالیاں دے رہی تھی۔ مگر توپوں کا رخ زیادہ تر ہماری طرف تھا۔ امی بھی سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں یہ کیا نئی آفت آ گئی ہے۔ بھئی بہت ہی ضعیف الاعتقاد لوگ ہیں۔ جانے کون انہیں اس قدر ڈرا رہا ہے۔ ہم معصوم سے بنے بیٹھے رہے۔ شام کو بھائی جان اپنے دوست کے گھر سے واپس لوٹے تو ہم نے چُپکے چُپکے پورا قصّہ سنایا۔ ہنس ہنس کر ہمارا بُرا حال تھا مگر ساتھ ہی ڈر بھی تھا کہ کہیں امی کچن سے باہر نہ نکل آئیں۔

مجھے ان ڈھیٹ لوگوں سے ایسی امید تو نہ تھی مگر اگلے روز کیا دیکھتے ہیں کہ ان کا سامان ریڑھے پر لد رہا ہے۔ ارشد نے یہ خوش خبری سنائی تو میں

اچھل پڑی۔ پھر دروازے پر ہی تو عابد نظر آیا۔

"عابد جا رہے ہو؟" میں نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں باجی! دشمنوں نے کچھ ایسا وار کیا ہے کہ اماں کے کلیجے میں رات سے سخت درد ہے۔ باجی کو بھی صحن میں رات بھر کچھ سائے ڈولتے نظر آتے رہے۔ پھر رات مالک مکان بھی آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ چھ ماہ کا کرایہ دو ورنہ مقدمہ کر دوں گا۔ ویسے بھی اماں تو کئی دن سے مکان ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہمیں دو گلیاں پرے ایک مکان مل گیا ہے۔ اب ہم نہیں رہتے اس منحوس مکان میں۔"

"ارے عابد!" اس کی باجی چلائیں تو وہ بھاگ گیا۔ بچے آخر بچے ہی ہوتے ہیں۔ سادگی میں وہ سب کچھ بتا گیا تھا۔

شام کو بچے گلی میں آزادانہ کھیل رہے تھے۔ خواتین ایک دوسرے کے ہاں ڈشز بھجوا رہی تھیں اور وہ رونق جو چھ ماہ سے ہمارے محلے میں عنقا تھی پھر سے لوٹ آئی تھی۔

"کیسا رہا آئیڈیا؟" بھائی جان نے پوچھا۔

"اے ون!" میں نے کہا اور ہم قہقہے لگا ہی رہے تھے کہ اچانک امی نمودار ہو گئیں۔ ہماری ہنسی کو بریک لگ گئے۔ مگر امی نے آگے بڑھ کر بھائی جان کا کان پکڑ لیا۔

"یہ کس آئیڈیا کا ذکر ہو رہا تھا؟"

"بتاتا ہوں امی بتاتا ہوں مگر میرا کان تو چھوڑیئے نا"۔

اور پھر ہم نے امی کو سارا قصہ سنایا۔ امی تو حیران پریشان کھڑی رہ گئیں۔

"ہوں! مجھے کچھ کچھ شبہ تو ہو رہا تھا۔ مگر جو حرکات ہو رہی تھیں یعنی تعویز اور پتلے اور کالے ماش وہ اتنی مکمل تھیں کہ میں تو سمجھ رہی تھی کہ کسی بڑے کی حرکت ہے۔ ارے تم تو چھپے رستم نکلے۔ بیچاری پڑوسن ٹھیک ہی کلپ رہی تھیں۔

"بیچاری؟" ہم تینوں ایک ساتھ چیخے۔

"چلو ہٹو! شیطان کہیں کے، بھولی صورتوں کے پیچھے......

"امی آپ پر بھی پڑوسن کا اثر ہو ہی گیا نا۔"

بھائی جان نے کہا تو امی بے اختیار انہیں مارنے کو لپکیں مگر بھائی جان پلک جھپکتے میں باہر نکل گئے اور امی مسکراتی ہوئی اپنی پسندیدہ جگہ یعنی کچن کی طرف روانہ ہو گئیں۔

بال جیسے پتے

آسٹریلیا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے پتے انسانی بال سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اسے "ہیرٹری" کہتے ہیں۔

تُو پاک وطن...

فضل رَبی راہی

رَگ رَگ میں ہر اک شخص کی جرأت سی بھری ہے
پُرکیف بہاروں کا، اُمنگوں کا چمن ہے
تو پاک وطن، پاک وطن، پاک وطن ہے

ہر پیر و جواں تیری ہی عظمت کا امیں ہے
شاہین صفت ہم سا کوئی اور نہیں ہے
اے پیارے وطن، ہم کو فقط تیری لگن ہے
تو پاک وطن، پاک وطن، پاک وطن ہے

پُرکیف بہاروں کا اُجالوں کا چمن ہے
تو پاک وطن، پاک وطن، پاک وطن ہے

تاروں سے چمکتا ہوا، خورشید سا روشن
پھولوں سے مہکتا ہوا، مہتاب سا گلشن
ہر فرد ترا، تیری ترقی میں مگن ہے
تو پاک وطن، پاک وطن، پاک وطن ہے

اس دیس کا ہر فرد بہادر ہے، جری ہے

فوجی اصطلاحات

جہانزیب صدیقی

آرسنل (ARSENAL) وہ عمارت جہاں بری فوج، فضائیہ اور بحریہ کا جنگی ساز و سامان تیار، ذخیرہ اور مرمت کیا جاتا ہے۔

ایرونانک۔ فضائی پرواز کے متعلق سائنس کو ایرونانک کا نام دیا جاتا ہے۔

الٹی میٹم۔ اس کا مطلب جنگ کی دھمکی یا آخری انتباہ ہے۔

انفنٹری۔ پیدل فوج کو ملٹری کی اصطلاح میں انفنٹری کہتے ہیں۔

ایٹم بم۔ اس کو اردو میں جوہری بم کہتے ہیں۔ یورینیم اور پلاٹونیم دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ یہ بم پہلی مرتبہ جنگِ عظیم دوم میں امریکہ نے جاپان کے خلاف استعمال کیا تھا۔

ایڈمرل۔ یہ دراصل عربی لفظ امیر البحر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ عربوں میں بحریہ کے سالار کو امیر البحر کہتے ہیں۔ انگریزوں نے عربی سے اخذ کر کے اس کو ایڈمرل بنالیا ہے۔

ایئر مارشل۔ کسی ملک کی فضائیہ کا افسر اعلیٰ۔ پوری فضائیہ کا انچارج۔

بریگیڈیر۔ ایک بریگیڈ کے کمانڈر انچارج کو بریگیڈیر کہتے ہیں۔

بٹالین۔ پیدل فوج کا ایک دستہ جو تین یا چار کمپنیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی کمان ایک لیفٹیننٹ کرنل کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

بارودی سرنگیں (EXPLOSIVEMINES)

یہ تانبے یا پیتل کی بنی ہوتی ہیں۔ ان کے خول میں تباہ کن گولہ بارود بھر کر دشمن کے علاقے میں خفیہ طور پر بچھا دیا جاتا ہے۔ جونہی دشمن کی بکتر بند

گاڑیاں یا ٹینک ان پر سے گزرنے لگتے ہیں، یہ پھٹ جاتی ہیں اور تباہی مچادیتی ہیں۔ دشمن کی پیش قدمی روکنے میں زبردست معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بحری بیڑہ۔ بحری جہازوں کے ایک ڈویژن کو کہتے ہیں۔

بریگیڈ۔ تین یا چار بٹالین پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے پاس پیدل فوج، بکتر بند دستے اور توپ خانہ ہوتا ہے۔

بیرک۔ چھاؤنی میں فوجیوں کی قیام گاہ' زیادہ ترامن کے زمانے میں استعمال ہوتی ہے۔

ٹامی گن (TOMY GUN) وہ ہلکی پھلکی بندوق جس سے خود کار طریقے سے گولیاں نکلتی ہیں۔

پیراشوٹ۔ یہ نام فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے جس کا مفہوم ہے "گرتی ہوئی جان کا تحفظ"۔ یہ ریشمی کپڑے کی بنی ہوئی ایک چھتری ہوتی ہے۔ خطرے کے وقت جہاز کا پائلٹ اپنی جان بچانے کے لئے اس کے ذریعے جہاز سے کود جاتا ہے۔

ٹینک۔ ایک مسلح فوجی گاڑی جس پر ہلکی توپیں اور مشین گنیں نصب ہوتی ہیں۔ یہ فولادی پٹڑی پر چلتا ہے اس پر ہلکے قسم کا گولہ اثر نہیں کرتا۔ موجودہ زمانے میں بھی جنگ جیتنے کے لئے اس کا استعمال ضروری ہے۔

راڈار (RADAR)۔ ایک سائنسی پردہ جس پر دشمن کے طیاروں کی تصویریں آجاتی ہیں اور ان کی نقل و حرکت کا پتا چل جاتا ہے۔

دنیا کی پہلی مردم شماری

تمہیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مردم شماری چین کی بہت پرانی ایجاد ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۵۶ء میں وہاں سب سے پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔ یہ ہان خاندان کا دورِ حکومت ہوگا۔ اس زمانہ میں افراد کی نہیں خاندان کی گنتی ہوتی تھی اور ہر خاندان میں اوسطاً پانچ شخص فرض کئے جاتے تھے۔ اس حساب سے ۱۵۶ء میں چین کی آبادی کا تخمینہ ۵ کروڑ کیا گیا تھا۔ مانا کہ یہ بالکل صحیح طریقہ نہیں ہے لیکن خیال تو کریں کہ وہ مردم شماری جو چین میں ۱۸ سو برس پہلے ایجاد ہوئی تھی مغرب میں ابھی رائج ہوئی ہے۔ یعنی کوئی ڈیڑھ سو برس ہوئے کہ ملک متحدۂ امریکہ میں سب سے پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔

(تاریخِ عالم پر ایک نظر۔ جواہر لال نہرو)

○ .... ○ .... ○ .... ○

حساب داں گھوڑا

جرمنی کے ایک شخص نے اپنے گھوڑے کو ریاضی جیسے مشکل مضمون میں تربیت دی ہے یہ گھوڑا پانچ منٹ کے اندر اندر چھ چھ ہندسوں کے جذر، مکعب اور چار چار ہندسوں والے اعداد کی ضرب نکال سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے تمام سوالات کے جواب اپنے سم کی ٹاپوں یعنی ٹک ٹک کی آواز نکال کر دیتا ہے۔

(مرسلہ..... علی جبران مخدوم پور پہوڑاں)

ذہن لڑایا، ببل بھی کھایا
پزل کا ہم نے انعام پایا

"ببل گم یا پزل گم" کا انعام کس نے جیتا؟

ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ساتھیوں کو ببل گم اتنی زیادہ پسند ہے۔ لگتا ہے آپ سب بڑے شوق سے ببل کھاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ہمیں موصول ہونے والے سینکڑوں درست جوابات سے ہوا۔ "ببل گم یا پزل گم" کے انعامی مقابلے میں ساتھیوں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ تقریباً تمام ہی ساتھیوں نے بالکل درست حل ارسال کئے۔ موصول ہونے والے بہت سے حل ادھورے اور نامکمل تھے جس کی وجہ سے وہ مقابلے میں شامل نہ ہو سکے۔

اس انعامی مقابلے میں انعام صرف ایک تھا اور درست حل بھیجنے والے ساتھی سینکڑوں کی تعداد میں تھے لہٰذا ہم نے فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے کیا اور اب ایک کے بجائے تین ساتھیوں کو انعامات دیئے جا رہے ہیں۔ ان تین ساتھیوں کے نام یہ ہیں:۔ (۱) مسعود احمد سومرو، (گڈو) سندھ (۲) محمد عظیم انجم غلزئی، (سبی) بلوچستان (۳) فرحت جہان (نوشہرہ،) سرحد

ادارے کی طرف سے ڈرائینگ کٹ کا انعام حاصل کرنے پر خوش نصیب ساتھیوں کو دلی مبارک باد۔ آپ کا انعام جلد ہی روانہ کر دیا جائے گا۔

جن ذہین ساتھیوں کو انعام نہیں مل سکا وہ مایوس نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے آئندہ مقابلوں میں قسمت ان پر مہربان ہو جائے۔ بالکل درست حل بھیجنے والے تمام ساتھیوں کے نام حوصلہ افزائی کے لئے شائع کر رہے ہیں۔ یہ آپ کی محنت کا انعام ہے۔

تمام دُرست جواب دینے والے ذہین ساتھیوں کے نام:۔

فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ محمد اختر قریشی، محمد عمر قریشی، محمد عظیم قریشی، نسیمہ اختر قریشی، سارہ خان، اسما صبور، احمد زبیر خان، ماریہ صبور، اسلام آباد۔ محمد عامر چیمہ، ملتان۔ وحید میر گل، ناجیہ خان، کراچی۔ شاکر ادریس، لاہور۔ شازیہ ارائیں، راولپنڈی۔ محمد یاسر نواز، عثمان احمد، عرفان احمد، اسلام آباد۔ حنا محمد یحییٰ، کراچی۔ امجد اقبال، گجرات۔ راجہ عمر جاوید، سرائے عالمگیر۔ نثار الحق اسدی، لاہور۔ مدثر الملک، سوات۔ رشید احمد، ساہیوال۔ صوفیہ، نادیہ، حوریہ، محمد حسیب الرحمٰن لاہور۔ ریحانہ صدیق، کراچی۔ شاہ حسین، گجرات۔ رمیزہ قریشی، عظمٰی عبدالرحمٰن، حیدر آباد۔ عمارہ انعام۔ سعدیہ سلیمی، علی بن ضیا، فیصل آباد۔ عدیل افتخار، کھاریاں کینٹ۔ محمد عمیر چیمہ، ملتان۔ فہد اشفاق لودھی۔ شبنم ناہید، جھنگ صدر۔ نعمان محمود کاشمیری، گوجرانوالہ۔ عادل، گوادر۔ محمد فہیم، پشاور۔ موقر عالم، ڈیرہ غازی خان۔ امجد علی فرہاد، پنجگور۔ زاہد نور، خالد نور، نل شہر (کوہاٹ) احسان الٰہی، اٹک۔ جواد شفیق، فیصل آباد، عنبرین سعید، لاہور۔ حنا تبسم، دردانہ حیدر، سہیل عزیز خان، فرح نواب، آغا محمد رضا، آغا وسیم حیدر، آغا منصور حیدر، آغا مدثر حیدر، کراچی۔ میاں نعیم الیاس، کھاریاں۔ مبشر فیروز، اسلام آباد۔ وجاہت علی، رحیم یار خان۔ ذوالفقار احمد، لاہور۔ نرگس خان، جویریا نورین، حاصل پور۔ عامر، اسلام آباد۔ سعدیہ یاور، راولپنڈی۔ سید محمد عارف شاہ، مرید کے۔ قاسم رشی، کراچی۔ شمیم کوثر، اسلام آباد۔ میاں عبدالرزاق، ملتان۔ نادیہ احمد، لاہور۔ محمد عرفان غوری، بھکر۔ منور علی، لاہور۔ عدنان مختار، فیصل آباد۔ رابعہ نور، صابرینہ احمد، لاہور، صغیرہ احسان، گوجرانوالہ۔ محمد طیب طاہر، جھنگ صدر۔ محمد عمر سومرو، خیرپور سادات۔ ثروت جبین، مردان۔ فوزیہ نذیر مغل، علی پور چنھہ۔ چوہدری آصف شہزاد علی، کاشف، عشرہ، عائشہ، فاطمہ، راولپنڈی۔ الفت تسلیم، پشاور۔ فرید ساجد مغل، بھکر۔ آمنہ بتول یونس، پشاور شہر۔ ممتاز، شہزاد خلیل، محمد اسماعیل سرسانہ، ملتان۔ مہوش نسیم، کوہاٹ۔ محمد شبیر، کھاریاں۔ محمد افضل، کراچی۔ نعمان احمد، ساہیوال۔ بوبی حمزہ، شور کوٹ۔ عبدالرحیم بلوچ، ہالا (سندھ) عمران حیدر شاہ، بھکر۔ نوید شبیر احمد، کراچی۔ رابعہ تہمینہ، کراچی۔ عمیر خالد، مریم خالد، اسلام آباد۔ ناصر علی، پہلجی اسٹیشن۔ تانیہ ہاشمی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ فیاض احمد، کراچی۔ عامر ظفر، عمیر ظفر، ثوبیہ ظفر، لاہور کینٹ۔ نایاب غضنفر، گوجرانوالہ۔ محمد ذیشان مجید، کاشف مجید، نعیم احمد پاشا، تنویر احمد پاشا، عشرت علی، نصرت علی، سرگودھا۔ طیب عزیز بٹ، جہلم۔ عبدالعزیز بٹ ساگری، جہلم۔ نگہت پاشا احسان، محمد شہزاد احسان، جہلم۔ نعمان عزیز، کراچی۔ نعمان محی الدین، میانوالی۔ نوید فاروق، کھاریاں کینٹ۔ شیخ محمد طیب، لاہور شاہد رضا میمن، نوابشاہ۔ سیدہ فادیہ تقدیس،

اٹک سٹی۔ راجہ عمران یوسف، راولپنڈی۔ میر عدیل پرویز، آزاد کشمیر۔ نجم السحر، راولپنڈی۔ رابیل غفار، لاہور۔ کاشف سلطان، ڈیرہ غازی خان۔ غلام مصطفیٰ گجر، لاہور۔ محمد انیس، جھنگ صدر۔ شازیہ حسن، پاک پتن۔ طاہر عزیز بٹ، جہلم۔ محمد آصف شریف، محمد عارف شریف، نازیہ خانم، فوزیہ خانم، سمیعہ خانم، طاہر خانم، سرگودھا۔ شفقت علی، رفاقت علی، اعجاز احمد، مقبول احمد، مہرین اختر، سرگودھا۔ محمد عمران شریف، محمد رضوان شریف، محمد تنویر ضیا، محمد نصیر ضیا، محمد ظہیر ضیا، محمد عدنان مجید، سرگودھا۔ سعنیہ بٹ، لاہور۔ رابعہ اعظم، بہاولپور۔ ثمینہ جمیل، مرزا غضنر جاوید، کراچی۔ محمد ظہیر الدین بابر، اٹک نوید اکمل، عبدالباسط، رحیم یار خان۔ دریہ قیصر، وقاص، فریحہ قیصر، شفق قیصر، زوبیہ رضا، ڈیرہ غازی خان۔ نوید ظفر، لاہور۔ ارسلان ظہیر عثمانی، حیدر آباد۔ ضیاء الرحمٰن مروت، تترخیل۔ آصف رضا خان، خانیوال۔ جاوید سعید، پسنی (مکران) سہام رفیق، چاچڑاں شریف۔ محمد اعجاز خرم، راولپنڈی۔ مسرت جہاں، اسلام آباد۔ غلام عباس شاہد، بھکر۔ ثاقب حکیم مغل، لاہور۔ عبدالشکور شیخ، شہداد کوٹ۔ غزلان جاوید، لاہور کینٹ۔ قاضی گڈو احسان، جہلم۔ محمد امین، نوابشاہ۔ آمنہ شفیق، لاہور۔ ارشد عباس، چار سدہ۔ محمد ادریس، پشاور۔ اطہر سعود ملک، راولپنڈی۔ فائزہ خان، پشاور۔ محمد علیم ولی، ٹنڈو آدم۔ احمد ذیشان حسن، اسلام آباد۔ محمد علی جواد، لاہور۔ فیصل علی گدی، حیدر آباد۔ طاہرہ ہلال عنایت، پشاور۔ محمد فیاض، لاہور۔ سارہ نکی، بہاولپور۔ نجمہ پروین، جہلم۔ ریاضت علی، لالہ موسیٰ۔ محمد عمران احمد، کراچی۔ قیصر نوید، گجرات۔ محمد عمران افسر بھٹی، اٹک۔ فیصل محمود خان، کراچی۔ زاہد حسین تھیبو، میرپور خاص۔ آصف علی، میانوالی۔ ناہید اختر، لاہور۔ محمد ریحان خان، حیدر آباد۔ طاہر رفیق، آزاد کشمیر۔ محمد افضل ساگر مچھوی، بولان۔ عاطف حسین صدیقی، شبنم، کراچی۔ سلمان نیازی، پشاور۔ سمیعہ رشید، حیدر آباد۔ خرم افضل، گوجرانوالہ۔ علی یاور، راولپنڈی۔ سید جواد خالد۔ کامرہ۔ زاہد ندیم بابر، خوشاب۔ محمد ساجد محمود، کشور۔ مصباح صدف، خوشاب۔ طلحہ احمد، لاہور۔

غلام غوث، فیصل آباد۔ خدیجہ گل، پشاور کینٹ، سرگودھا۔ امتیاز علی میمن، لاڑکانہ۔ جمعیت خاتون، حیدر آباد۔ خدیجہ گل پشاور کینٹ۔ شمائلہ امان، مردان۔ عالیہ فاروق، وہاڑی۔ افشاں وحید، راولپنڈی۔ عثمان رفیق، اسلام آباد۔ حنا جتوئی، حیدر آباد۔ محمود احمد جٹ، کراچی۔ اشفاق احمد ناز، کراچی۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ عبدالسلام، گوجرانوالہ۔ محمد عظیم انجم، سبی (بلوچستان) شیر نواز گل، ارمڑپایان۔ کرن نوشین عارف، ملتان۔ صباح ارم، واہ کینٹ۔ عبدالرزاق، اٹک سٹی۔ ثوبیہ طاہر، پنڈی گھیب۔ اظہر کمال، کراچی۔ عظمیٰ مجید، نعمان مجید، لاہور۔ محمد ثاقب، راولپنڈی کینٹ۔ عطاء الرحمٰن، پشاور صدر۔ محمد علی، کراچی۔ شاہد پرویز رانا، خوشاب۔ وسیم شہزاد، گوجرانوالہ۔ طاہر روشن، کراچی۔ عمار وحید سلیمانی، لاہور۔ عدیل احمد ملک، راولپنڈی۔ علی ریاض، ملتان۔ عثمان قادری، کراچی۔ زم زم اسلم، پشاور کینٹ۔ گل زمان، لاہور۔ سکندر اکرام، فیصل آباد۔ فریدہ انجم، راولپنڈی۔ سید عثمان حسنی، لاہور۔ صبا مقصود، کراچی۔ محمد اشرف فیصل آباد۔ فرحت جہاں، نوشہرہ۔ سید فاروق حسنی، لاہور۔ فرحانہ اسمٰعیل، رضوان اسمٰعیل، عمران اسمٰعیل، عدنان اسمٰعیل، کراچی۔ منصور احمد، ٹیکسلا (سندھ) فصیحہ طارق، کراچی۔ فریحہ رفیق، اسلام آباد۔ مسعود احمد سومرو، گڈو (سندھ) حماد علی فیصل، زاہد علی واصل، کراچی۔ خلیفہ اسد حماد صدیقی، ملتان۔ اکمل شاعر، پسنی (مکران) عمر حیدر، اسلام آباد۔ شمونہ حمید روحی، لاہور۔ محمد عرفان الحق، محمد نعمان الحق، اسلام آباد۔ ثمرینہ مصطفیٰ، کرن مصطفیٰ، گجرات۔ سردار خان، دریا شریف۔ محمد علی، ملتان۔ سید محمد صبیح زیدی، کراچی۔ شیخ عاطف جمشید، ملتان۔ عالیہ نوید، پشاور شہر۔ روید حسین، گنج گیٹ۔ اشعر فواد، ملتان۔ فہد عمران فردوس، کراچی۔ حیران احمد، کراچی۔ مرزا محمد صادق، جہلم۔ عظمیٰ اعجاز، جہلم۔ عمران احمد، کراچی۔ آفتاب علی، ملتان شہر۔ انیلا ہاشمی، انیلا سیف، سدرہ سیف، کراچی۔ راؤ اقبال شاہد بہادر، نوابشاہ۔ ارجمند ظفر، اسلام آباد۔ محمد عبدالسلام، کراچی۔ فاخر شاہین، لاہور۔ رمیش لعل، بخشاپور (سندھ) راحیل احمد، راولپنڈی۔ راج کملای جیرام داس، حیدر آباد۔ ریاض اسرار بیگ، کراچی۔ فائزہ سیف، حرا سیف، کراچی۔ سید مظہر علی، حسان صدیقی، انعم صدیقی، عاصم علی، حورالعین، کراچی۔ رفعت سلیمان، حیدر آباد۔ محمد منصور مغل اشرفی، حیدر آباد۔ نور حسین مری، میرپور خاص۔ منوج کملا بچانی، حیدر آباد۔ تنویر حسین، کراچی۔ ذکیہ زیدی، راولپنڈی۔ صوفیہ وحید، کراچی۔ سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ محمد علی صدیقی، کراچی۔ فرید احمد، پشاور۔ بسام وحید، کراچی۔ حارث صدیقی، اٹک۔ امر جلیل، خیرپور میرس۔ مصحف رسول، کراچی سید وقاص احمد، لاہور۔ احمر فرقان، ملتان۔ بشریٰ علوی، پنارو۔ ملک طارق محمود اعوان، گولارچی (سندھ) شازیہ فاروق، فاروق، راولپنڈی۔ ظہیر اقبال، عمیر اقبال، سارہ اقبال، ملتان۔ مرزا شیر جنگ، گجرات۔ نگہت فاطمہ، ملتان۔ ضماد بن اعجاز، ملتان۔ امرین، نوین، نوشین، سنعیہ، فرح، محمد فیصل رفیق، کراچی۔ قرۃ العین عزیز، حافظ آباد (پنجاب) محمد زاہد ارشاد، خانپور۔ شازیہ فیض، کراچی۔ حمیرا بتول، عبید علی، ایمان علی، کراچی۔ مرزا محمد اعظم، گجرات۔ زہرہ غوث صدیقی، کراچی۔ مطاہر احمد قادری، رحیم یار خان۔ محمد عمران سعید، عدیل احمد، کراچی آصف بشیر کلیم اللہ بشیر لودھراں۔ عمران بشیر کراچی۔ سید زاہد عباس بخاری، مظفر گڑھ۔ غلام محمد، جھنگ۔ نادیہ عروج، کراچی۔ فرزانہ رفیع، لاہور کینٹ۔ جویریہ قیوم نیازی، خوشاب۔ ثنا سحر، حاصل پور۔

تحفہ

عثمان بن سلیم

عالی برآمدے کی سیڑھیوں پر اکڑوں اداس بیٹھا تھا۔ درخت سے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے قدموں میں بکھر رہے تھے۔ خزاں کا موسم تھا اور عالی کا چہرہ بھی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے بائیں جانب والے کمرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں اس کے چچا نے اس کا داخلہ بند کیا ہوا تھا۔ وہ کمرہ ایک بڑی سائنسی لیبارٹری تھا جہاں اس کے چچا عزت جاہ سائنسی تجربات میں مصروف رہتے تھے۔ عالی سے انہیں بے حد پیار تھا لیکن تجربات کے دوران وہ اسے لیبارٹری میں نہیں آنے دیتے تھے۔ عزت جاہ سائنس کے پروفیسر تھے اور ان کا شمار ملک کے نامور سائنس دانوں میں ہوتا تھا۔ آج کل وہ ایک ایسے محلول پر ریسرچ کر رہے تھے جو انہوں نے مختلف مرکبات سے تیار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ محلول انسانی زندگی بچانے کے کام آئے گا۔ عالی کو سائنس سے بالکل دلچسپی نہیں تھی اس لئے چچا کی بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن وہ کبھی کبھی چچا کی لیبارٹری میں جا کر انہیں تجربات کرتا دیکھتا رہتا۔ اس کے چچا کو اپنے سائنسی تجربوں سے عشق تھا۔ وہ تجربات میں ہمہ وقت مصروف رہتے، کھانے پینے کی بھی انہیں کوئی پروانہ ہوتی۔ بھائی کے برعکس

عالی کے ابّو معظم جاہ قالینوں کے ایک بڑے تاجر تھے۔ عالی ان کا اکلوتا بیٹا تھا جب وہ چھوٹا سا تھا تو ان کی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ عالی کو انہوں نے ماں بن کر پالا تھا اور اس کی خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ان کے بھائی عزت جاہ نے بھی شادی نہیں کی تھی۔ انہیں سائنسی تجربوں سے عشق تھا وہ بھائی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ معظم علی نے ان کے لئے گھر ہی میں ایک بڑی سائنسی لیبارٹری بنوا دی تھی۔

عالی جاہ نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ معظم جاہ صبح اپنے کاروبار پر چلے جاتے اور عزت جاہ اپنی لیبارٹری میں اپنے سائنسی تجربات میں مصروف ہو جاتے تو عالی بڑے سے گھر میں اکیلا رہ جاتا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے بہت سارے بہن بھائی ہوتے جن کے ساتھ وہ کھیلتا کودتا، شرارتیں کرتا لیکن اس کا بچپن شرارتوں کے بغیر گزرا تھا۔ اسے ماں کا پیار نہیں مل سکا تھا لیکن اس کے ابو اس سے بے حد پیار کرتے۔ وہ جس چیز کی فرمائش کرتا، ابو پوری کرتے تھے۔ گھر میں اگر اس کی کوئی فرمائش پوری نہ کرتا تو وہ چچا تھے۔ ان کے پاس اس کے لئے بالکل وقت نہ تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ چچا اس سے پیار نہیں کرتے تھے۔ وہ اس سے بہت پیار کرتے تھے لیکن انہیں اپنے سائنسی تجربات سے اتنا عشق تھا کہ وہ اس کی ہر بات بڑے پیار سے ٹال جاتے تھے۔

اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں جب سے پڑی تھیں عالی ان سے ضد کر رہا تھا کہ اسے بازار لے جا کر وہ بَلّا دِلا دیں جس پر جاوید میانداد کے آٹوگراف ہیں لیکن عزت جاہ روز کہتے کہ بازار چلیں گے اور روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اپنی لیبارٹری میں گھس جاتے اور سائنسی تجربات میں مصروف ہو جاتے۔

ابو بھی ان دنوں بے حد مصروف تھے اس لئے عالی کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ابو سے بلا خریدنے کی فرمائش کرے۔ جب وہ آٹھویں میں اول آیا تھا تو چچا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے بازار لے جا کر ایک خوبصورت سا تحفہ دلائیں گے لیکن ان کا وعدہ ..... جھوٹا نکلا تھا۔ عالی چاہتا تو خود بازار جا کر بلا خرید سکتا تھا لیکن وہ کبھی اکیلا بازار نہیں گیا تھا۔ اسے تو ابّو یا چچا کے ساتھ بازار جانا اچھا لگتا تھا۔

اس وقت بھی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر اداس بیٹھا تھا۔ خزاں کا موسم تھا اور درختوں سے زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے قدموں میں بکھر رہے تھے۔ عالی کی نگاہیں بائیں جانب والے بڑے سے کمرے پر جمی ہوئی تھیں جو ایک بڑی سائنسی لیبارٹری تھا اور جہاں عزت جاہ کسی محلول پر کوئی انوکھا تجربہ کر رہے تھے۔

نگاہیں بدستور لیبارٹری کے دروازے پر مرکوز تھیں کہ اچانک دروازہ کھلا اور عزت جاہ سفید گاؤن میں ملبوس خوشی سے چلاتے ہوئے باہر نکل آئے۔

"میں کامیاب ہو گیا۔ میرا تجربہ سو فیصد کامیاب

رہا۔"

انہوں نے دوڑ کر عالی کو سینے سے لگالیا۔ اور اسے گھماتے ہوئے خوشی سے بھرپور لہجے میں بولے۔ "میری کئی ماہ کی محنت آخر کار رنگ لے آئی۔ میرا تجربہ کامیاب رہا ہے۔"

وہ ایک لمحہ سانس لینے کو رکے پھر عالی کے گال تھپتھپا کر بولے۔ "منّے! آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں تمہیں بازار لے جاؤں گا اور تمہاری پسند کا تحفہ دلاؤں گا۔" عالی کو چند لمحوں تک یقین ہی نہ آیا پھر وہ "سچ!" کا نعرہ لگا کر عزت جاہ سے لپٹ گیا لیکن عین اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ عزت جاہ نے ٹیلی فون سنا پھر وہ نہایت گھبرائے ہوئے عالی کے پاس آئے۔

"عالی! جلدی کرو۔ ہمیں ہسپتال چلنا ہے۔"

"تو کیا بازار نہیں جائیں گے؟" عالی نے پوچھا۔

"نہیں!" انہوں نے کہا۔ "تمہارے ابو کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ شدید زخمی ہیں۔ ہمیں فوراً ہسپتال پہنچنا ہے۔"

عالی یہ جملے سن کر رونے لگا۔ اسے ابو سے بے حد محبت تھی۔ عزت جاہ نے اسے چپ کرایا اور پھر وہ گاڑی میں ہسپتال پہنچے تو اصل صورتحال معلوم ہوئی۔ عالی کے ابو کا کافی سارا خون بہہ گیا تھا اور جس گروپ کا خون درکار تھا وہ ہسپتال میں موجود نہ تھا۔ عزت جاہ اور عالی نے اپنا خون چیک کرایا لیکن ان کا خون بھی ابو کے خون سے نہیں مل رہا تھا۔

ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر بے حد پریشان تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "ہمیں جلد از جلد مطلوبہ خون کا انتظام کرنا ہوگا ورنہ مریض کی موت واقع ہو جائے گی۔"

ڈاکٹر کی یہ بات سن کر عالی زور زور سے رونے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! میرا انتظار کریں! میں ابھی خون کا بندوبست کرتا ہوں۔" عزت جاہ تیزی سے ہسپتال کی عمارت سے باہر نکل کر پارکنگ لاٹ کی طرف بھاگے اور پھر ان کی کار تیز رفتار کے ریکارڈ توڑتی ہوئی گھر کی جانب دوڑ پڑی۔

"یہ کیا ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب! یہ میری حیرت انگیز ایجاد ہے۔ یہ محلول میں نے کئی ماہ کے تجربات کے بعد بنایا ہے۔ یہ محلول ان مریضوں کے لئے ہے جن کا کسی حادثے میں خون بہہ گیا ہو اور انہیں خون کی اشد ضرورت ہو۔ یہ محلول کسی بھی گروپ کے مریض کو دیا جا سکتا ہے اور یہ محلول جسم کے اندر پہنچتے ہی تیزی کے ساتھ نیا خون بنانے لگتا ہے۔ آپ اسے آزمایئے تو!!!" پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان عزت جاہ نے بتایا۔ اس محلول کو لانے کے لئے انہیں گھر جانا پڑا تھا اور یہ کام انہوں نے بھاگتے دوڑتے کیا تھا۔ "جلدی کریں ڈاکٹر صاحب! میرے بھائی کی زندگی خطرے میں۔"

"لیکن! ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔" ڈاکٹر نے

پیسہ بولتا ہے

فرانس کا مشہور ناول نگار بالزاک جب پہلی بار "وی آنا" گیا تو وہاں کی زبان اور اس کے سکّے سے نابلد تھا حتی کہ جب بھی وہ ٹیکسی کرایہ پر لیتا تو نہ ڈرائیور کی زبان سمجھ سکتا اور نہ ہی کرایہ کی رقم کا اندازہ کر سکتا۔ آخر اس نے ایک ترکیب نکالی۔

نفی میں سر ہلایا "میں ایک سائنس دان ہوں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔" عزت جاہ نے ڈاکٹر کو اپنا کارڈ دکھایا اور ڈاکٹر چونک پڑا۔ "اوہ! آپ عزت جاہ ہیں!!" ڈاکٹر نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "سائنس کے شعبے میں آپ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی خاطر میں یہ رسک لینے کے لئے تیار ہوں کیوں کہ خون کا ابھی تک انتظام نہیں ہو سکا ہے۔" ڈاکٹر محلول سے بھری شیشی لے کر مڑا اور آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ آپریشن اسٹارٹ تھا۔ ڈاکٹر نے جلدی جلدی محلول کو معظم جاہ کے جسم میں منتقل کرنا شروع کیا اور کچھ ہی دیر بعد اس نے آپریشن تھیٹر سے باہر آکر عزت جاہ سے ہاتھ ملایا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا "مبارک ہو! آپ کے محلول کا تجربہ سو فیصد کامیاب رہا اللہ تعالیٰ نے آپ کے بھائی کی زندگی بچالی۔ ان کا خون تیزی سے بن رہا ہے۔ اور اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔" "میرے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" عزت جاہ نے عالی کو اپنے سینے سے لپٹا لیا جو ابھی تک رو رہا تھا۔ ڈاکٹر کی مسرت بھری آواز سنائی دی۔ "آپ کی حیرت انگیز ایجاد نے نہ صرف آپ کے بھائی کی جان بچالی ہے بلکہ اب یہ ایجاد لاکھوں کروڑوں لوگوں کی جان بچانے کے کام آئے گی۔ یو آر گریٹ مسٹر عزت جاہ!!!" ڈاکٹر نے بڑی گرمجوشی سے عزت جاہ سے ہاتھ ملا کر مبارک باد دی پھر کسی مریض کو دیکھنے چلا گیا۔

"چچا! آپ اس محلول کی تیاری کے دوران مجھے بالکل وقت نہیں دیتے تھے، میں آپ سے ناراض تھا لیکن اب میں آپ سے بالکل ناراض نہیں کیوں کہ اگر آپ یہ محلول ایجاد نہ کرتے تو آج ابّو.....

عالی کی یہ بات سن کر عزت جاہ مسکرائے پھر بھتیجے کا بازو تھام کر بولے۔

"چلو! ابھی بازار چلتے ہیں تمہارے ابو کے ہوش میں آنے سے پہلے پہلے میں تمہیں تمہارا تحفہ دلا دوں۔"

"لیکن آپ نے تو مجھے بہت قیمتی تحفہ دیا ہے۔"

عالی نے چچا کا ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر کہا۔

"کون سا تحفہ؟" چچا عزت جاہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ابو کا تحفہ ــــ آپ محلول ایجاد نہ کرتے تو ابو تو چھن گئے تھے۔" عالی نے کہا۔ "نہیں بیٹے تمہارے ابو کو تو اللہ نے زندگی دی ہے۔

آؤ تمہیں تحفہ دلاتے ہیں۔"

آنکھ مچولی البم

اوں ہوں ۔ گندا ۔ میرا جھوٹا بھی پے گیا!

بچاؤ

آٹھویں قسط

بچوں کے مقبول مصنف اشتیاق احمد کے قلم سے

فاروق، فرزانہ اور محمود تینوں گھر میں اکیلے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور ان کی بیگم کسی عزیز کی شادی کی تقریب میں گئے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ اچانک دستک پر دروازہ کھولا گیا تو ایک زخمی بریف کیس سمیت اندر چلا آیا۔ یہ پروفیسر عمران جاہ تھے جو انشارجہ سے کوئی خطرناک فارمولا لے کر فرار ہوئے تھے۔ دشمن بھی ان کے تعاقب میں گھر کے اندر آپہنچا اور ایک طویل ذہنی اور جسمانی جنگ کا آغاز ہوا۔ تینوں نے اپنی ذہانت سے مسلح دشمن پر قابو پالیا تھا اور اب دس کے دس مجرم ان کے سامنے بندھے پڑے تھے۔ سب انسپکٹر اکرام اور ان کے ساتھی بروقت وہاں پہنچے تھے۔ لیکن ابھی قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ آرمی کا ایک میجر اور چند فوجی اس فارمولے کی تلاش میں وہاں آپہنچے۔ یہ دشمن کی ایک اور گہری چال تھی۔ فرزانہ فارمولے سمیت غائب تھی اور یہی ایک بات ان کے حق میں جاتی تھی۔ نقلی میجر نے تشدد کے ذریعے ان کی زبان کھلوانے کی ناکام کوشش کی۔ پھر اس نے فرزانہ کو مسہری کے نیچے چھپے ہوئے دیکھ لیا۔ اور وہاں سے ایک پیکٹ بھی برآمد کیا مگر یہی پیکٹ مجرموں کے لئے مصیبت بن گیا۔ وہ ایک دھواں بم تھا۔ بم کے پھٹتے ہی تمام مجرم بے ہوش ہو گئے۔ مگر پروفیسر عمران جاہ سب انسپکٹر اکرام اور تینوں بچے ایک مخصوص ٹیبلٹ کھانے کی وجہ سے بے ہوش نہ ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید بھی واپس آ گئے۔ تمام حالات معلوم کرنے کے بعد وہ فوج کی مدد سے سب ساتھیوں سمیت شہر کی سب سے محفوظ عمارت میں منتقل ہو گئے۔ دشمن بہت چالاک تھا۔ یہ عمارت بھی اس کی پہنچ سے دور نہ رہ سکی۔ ایک غدّار، دشمن سے جا ملا اور امکان تھا کہ اندر کے راز باہر جاتے مگر انسپکٹر جمشید نے اسے پکڑ لیا۔ دشمن نے ایک چال اور چلی اور سب انسپکٹر اکرام کا بھیس بدل کر عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر اس بار بھی وہ انسپکٹر جمشید کی عقابی نظروں سے بچ نہ سکا اور گرفتار کر لیا گیا۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

اکرام اچھل کر دور جا گرا۔ بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر وہ اٹھا اور اس گاڑی کی طرف دوڑ پڑا جس میں وہ آیا تھا۔

"گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیئے جائیں۔" انسپکٹر جمشید نے چلا کر کہا۔

فوراً فائرنگ کی آواز گونجی..... ٹائر پھٹنے کے دھماکے ہوئے اور انسپکٹر جمشید نے اکرام کو باہر نکل کر بھاگتے دیکھا۔

"خبردار!..... کوئی اسے گولی نہ مارے۔" انسپکٹر جمشید نے اعلان کیا اور اس کے پیچھے دوڑے۔

اب دونوں بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اگلا آدمی دوڑ میں ان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے..... شاید وہ دوڑوں کے مقابلوں میں حصہ لیتا رہا تھا..... ورنہ اس قدر تیز نہیں دوڑ سکتا تھا..... اب تک درمیانی فاصلہ ذرا بھی کم نہیں ہو سکا تھا۔ جبکہ بڑھ بھی نہیں رہا تھا..... ایسے میں انسپکٹر جمشید کو ایک خیال آیا..... انہوں نے جیب سے پستول نکالا اور اس کی ٹانگ پر فائر کر دیا۔ فائر کے ساتھ ہی وہ گرا..... اٹھا اور لنگڑا کر دوڑنے لگا۔ جلد ہی انسپکٹر جمشید اس کے نزدیک پہنچ گئے..... اس نے بھی ان پر فائر جھونک مارا..... اگر وہ جھکائی نہ دے جاتے تو گولی ان کے سر میں لگ چکی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اس پر چھلانگ لگائی..... اور اسے چھاپ بیٹھے۔

"کون ہو تم..... اور اکرام کہاں ہے؟"

"ہر سوال کا صرف اور صرف ایک جواب..... میں نہیں جانتا۔"

"اچھا یہ بات ہے....." انہوں نے جھلا کر کہا اور اسے کلائی سے پکڑ کر عمارت کی طرف لے چلے..... دوسری طرف سے کمانڈر انچیف آ رہے تھے۔

"یہ..... یہ سب کیا ہے!؟"

"یہ نقلی اکرام ہے..... میرے خفیہ جملے کا جواب یہ نہیں تھا جو اس نے دیا۔"

"اوہ!..... لیکن یہ کیسے ہو گیا..... آپ کے اسسٹنٹ تو آپ کے گھر سے کچھ چیزیں لینے گئے تھے؟"

"ہاں..... معلوم ہوتا ہے میرے گھر پر بھی اس وقت تک دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔" انہوں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے..... آپ کے اسسٹنٹ اس وقت دشمنوں کے قبضے میں ہیں؟"

"اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے!..... ٹھہریں میں فون کرتا ہوں۔"

اندر آ کر انہوں نے گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً بیگم کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو بیگم! یہاں ہر طرح سے خیریت تو ہے؟"

"ہاں..... ہر طرح سے خیریت ہے۔"

"اکرام یہاں آیا تھا؟"

"آئے تھے..... جو چیزیں آپ نے منگائی ہیں..... وہ لے گئے ہیں۔"

"تو اس وقت ہمارا گھر دشمنوں کے قبضے میں نہیں ہے؟"

"جی نہیں تو!..... آپ سے کس نے کہہ دیا؟" بیگم جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

"میرے اندازے نے۔" وہ مسکرائے۔

"آپ کے اندازے بھی اب غلط ہونے لگے۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں بھی آخر انسان ہوں۔" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"اندازہ غلط نکلا..... اکرام پر حملہ اس وقت کیا گیا، جب وہ گھر سے نکل آیا تھا۔"

"تب پھر یہ حضرت بتائیں گے..... وہ کہاں ہے۔" کمانڈر بولے۔

"جی ہاں..... اب یہ کام بھی کرنا پڑے گا..... اکرام کو دشمنوں کی قید میں نہیں چھوڑا جا سکتا..... لیکن....." انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔

"لیکن کیا؟"

"مجھے رابل سے اس حرکت کی امید نہیں تھی..... کیا وہ اس طرح پروفیسر عمران جاہ کی جان لینے اور وہ پیکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا؟"

"واقعی..... یہ تو بہت ہی بچکانہ حرکت تھی۔" کمانڈر بولے، لیکن اسی وقت انسپکٹر جمشید چونکے۔

"اوہ نہیں..... اس کی یہ چال کم گہری نہیں ہے۔"

"وہ کیسے؟" باقی لوگ چونک کر بولے۔

"اب لازمی بات ہے کہ مجھے اکرام کی تلاش میں نکلنا پڑے گا..... گویا اس عمارت میں میں موجود نہیں ہوں گا اور وہ میری عدم موجودگی میں اپنا کام دکھانے کی کوشش کرے گا۔"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے..... لیکن آپ جائیں ہی کیوں؟..... آپ کے اسسٹنٹ کی تلاش میں ہم اور لوگوں کو بھیج سکتے ہیں۔"

"پہلے تو اس سے اگلوانا پڑے گا کہ اکرام ہے کہاں؟"

انہوں نے زخمی آدمی کو تیز نظروں سے دیکھا

اور بولے۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے..... لہٰذا فوراً بتادو..... اکرام کہاں ہے؟"

"باس کے پاس۔" اس نے فوراً کہا۔

"اور باس کہاں ہے؟"

"اپنے اڈے پر۔" وہ بولا۔

"اڈہ کہاں ہے؟"

"سونا گھاٹ پر۔" وہ مسکرایا۔

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

سونا گھاٹ جرائم پیشہ لوگوں کی بستی تھی۔ جیل سے رہا ہونے والے لوگ فوراً سونا گھاٹ کا رخ کرتے تھے اور دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کے لئے کام کرتے تھے..... وہاں ان گنت ایسے لوگ رہتے تھے۔ اور اگر اس شخص کا بیان درست تھا تو پھر اس کا مطلب یہ تھا کہ رابل نے یہاں پہنچتے ہی کسی خاص جرائم پیشہ کی خدمات بھی حاصل کرلی تھیں اور اس سے کام لے رہا تھا..... اب اس بستی میں جاکر اکرام کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا اور اگر وہ نہ جاتے تو جانے وہ لوگ اکرام کا کیا حال کرتے..... وہ الجھن میں پڑ گئے۔ آخر بولے۔

"دیکھو مسٹر..... اگر تمہارا یہ بیان درست ثابت ہوا تو تمہیں بہت معمولی سزا ملے گی اور اگر بیان غلط ہوا تو لمبی سزا دلواؤں گا..... لہٰذا اب بھی وقت ہے..... سچ بات بتادو۔"

"آپ کے اسسٹینٹ اگر سونا گھاٹ سے برآمد نہ ہوں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

یہ سن کر وہ عمارت کے اندر آئے' انہیں ساری صورت حال بتائی اور بولے۔

"اکرام کے لئے مجھے جانا ہوگا..... جب تک میں نہ لوٹوں..... تم اندر سے کسی کے لئے بھی دروازہ نہیں کھولوگے' یہاں تک کہ کمانڈر انچیف صاحب بھی اگر تمہیں حکم دیں..... تو بھی تم کسی کے لئے دروازہ نہیں کھولوگے۔"

"بہت بہتر ابا جان۔"

"آپ فکر نہ کریں..... کوئی انہیں دروازہ کھولنے کے لئے نہیں کہے گا۔" کمانڈر انچیف بولے۔

"اب آپ ذرا باہر جائیں' مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔" انہوں نے کمانڈر صاحب سے کہا۔ وہ باہر چلے گئے..... ان کے جاتے ہی انہوں نے فوراً حوالدار محمد حسین آزاد کو فون کیا۔

"فوراً یہاں پہنچو۔" یہ کہہ کر انہوں نے عمارت کا نام اور پتا نوٹ کرادیا۔

"محمد حسین آزاد کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"یہاں تم لوگوں کے پاس بھی تو کوئی ہونا چاہئے۔" وہ مسکرائے۔

"اوہاں!" تینوں ایک ساتھ بولے۔

جلد ہی دروازے پر دستک ہوئی اور کمانڈر انچیف صاحب کی آواز سنائی دی۔

"باہر کوئی حوالدار محمد حسین آزاد آئے

ہیں..... کیا انہیں آپ نے بلایا ہے؟"

"ہاں بلایا تو ہے..... محمد حسین آزاد..... کیا یہ تم ہی ہو؟"

"جی ہاں! ہوں تو میں ہی۔"

"اپنا نام بتاؤ؟"

"کالیا ولد میاں خان۔"

"شکریہ! کمانڈر صاحب..... آپ انہیں اندر آنے دیں..... جونہی یہ اندر داخل ہوں دروازہ باہر سے بند کر دیا جائے۔"

"اچھی بات ہے۔" انہوں نے کہا۔

دروازہ کھلا اور محمد حسین آزاد اندر داخل ہوا..... انہوں نے مزید اطمینان کے لئے اسے اچھی طرح چیک کیا اور پھر اسے ہدایات دینے لگے۔ انہوں نے کچھ اور بھی ضروری کام انجام دیئے..... قریباً ایک گھنٹے بعد بیرونی دروازہ کھلوایا گیا۔

"لیجئے جناب! اب آپ پوری طرح ہوشیار رہیئے گا..... ہمارا مقابلہ انشارجہ کے زلزلے سے ہے..... اور وہ بہت چالاک ہے، کہیں کوئی چال نہ چل جائے۔"

"ہم اندر کسی کو داخل ہی نہیں ہونے دیں گے۔" وہ بولے۔

"آپ خود بھی اندر داخل نہیں ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اچھی بات ہے..... مجھے اندر جانے کی بھلا ضرورت بھی کیا ہے۔ ویسے کیا آپ مجھے بھی شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں؟"

"شک کی نظروں سے تو سبھی کو دیکھنا پڑتا ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

"تو کیا آپ سونا گھاٹ جائیں گے؟"

"ہاں!..... اور کیا کر سکتا ہوں..... پوری فورس کو ساتھ لے کر گیا تو سب لوگ چھپ جائیں گے۔"

"لیکن آپ اتنے بہت سے آدمیوں کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟"

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں..... اب ہمیں اپنا اپنا محاذ سنبھالنا ہے۔" انہوں نے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ان کی جیپ سیدھی سونا گھاٹ جا کر رکی..... انہوں نے گاڑی سے اتر کر چاروں طرف کا جائزہ لیا..... وہ جانتے تھے..... اکرام کہاں ہو سکتا ہے..... لہٰذا وہ سیدھے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہوٹل تھری اسٹار کے سامنے پہنچ کر وہ رک گئے..... انہوں نے دائیں بائیں کا جائزہ لیا..... یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان کی طرف متوجہ نہ ہو..... لیکن بہت سی نظریں ان کا جائزہ لے رہی تھیں..... آخر وہ بے دھڑک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور سیدھے کاؤنٹر پر جا رکے۔

"روڈی کہاں ملے گا؟"

"اوہ! انسپکٹر جمشید آپ..... روڈی اس وقت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ارشادات

۱..... سب سے آسان نیکی خندہ پیشانی اور شیریں کلامی ہے۔

۲..... علم تلاش کرو چاہے وہ دشمن کے پاس ہو۔

۳..... دوسروں کے عیب ڈھونڈنے سے پہلے اپنے عیبوں پر نظر ڈالو۔

۴..... جس طرح میٹھا شربت پی جاتے ہو اسی طرح غصہ بھی پی جایا کرو۔

۵..... اخلاق خراب ہیں تو ایمان بھی خراب ہو گا۔

۶..... گناہ کرنا چاہتے ہو تو وہ جگہ تلاش کرو جہاں اللہ موجود نہ ہو۔

۷..... بندہ خواہ وہ خدا کے نزدیک بر گزیدہ کیوں نہ ہو مگر جب اس کو دنیا کا کچھ حصہ مل جاتا ہے تو خدا کے یہاں اس کا کوئی نہ کوئی درجہ ضرور گھٹ جاتا ہے۔

۸..... میں پہلے خود حدیث پر عمل کرتا اور پھر لوگوں کو سناتا ہوں۔

کمرہ نمبر ۲۳۱ میں ہے۔"

"شکریہ! اسے فون کرنے کی کوشش نہ کرنا..... ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"ہمارے خیال میں تو آپ سے اچھا کوئی نہ ہو گا۔" کاؤنٹر کلرک نے گھبرا کر کہا۔

اور پھر وہ لفٹ کے ذریعے دوسری منزل پر پہنچ گئے..... کمرہ نمبر ۲۳۱ کے دروازے پر دستک دیتے ہی اندر سے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"چلے آئیں..... دروازہ کھلا ہے۔"

وہ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئے..... فوراً ہی کسی نے تیز آواز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے دیکھا' اندر ایک گینڈا نما آدمی موجود تھا۔

"کس بات کا مطلب پوچھ رہے ہیں مسٹر روڑی۔"

"آپ یہاں کیسے آ گئے؟"

"ڈرامہ نہ کریں..... میں جانتا ہوں..... تم میرا انتظار کر رہے تھے۔" انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

"خیر ہو گی یہ بات..... کہیئے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"اکرام کہاں ہے؟"

"ابھی لیجئے....." یہ کہہ کر اس نے تالی بجائی..... فوراً ہی ایک سیاہ فام آدمی اندر داخل ہوا۔

"کیا حکم ہے میرے آقا۔" اس نے کسی جن کے انداز میں کہا۔

"انسپکٹر جمشید کے اسسٹینٹ کو لے آؤ۔"

"ابھی حاضر کرتا ہوں میرے آقا۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا..... جلد ہی اس کی واپسی ہوئی..... اکرام اس کے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ کمر پر بندھے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر ٹیپ چپکا دی گئی تھی۔

"اس کے ہاتھ کھول دو..... اور منہ بھی.....

میں جاننا چاہتا ہوں..... تم نے اس کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کی ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"تم نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے انسپکٹر جمشید۔" روڑی ہنسا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکے۔

"یہ پورا ہوٹل اس وقت جرائم پیشہ افراد نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہے..... وہ تمہیں کچا چبا جانا چاہتے ہیں۔ مسٹر رابل نے ہمیں اس بات کی کھلی چھٹی دی ہے کہ ہم تمہارے ساتھ جو جی میں آئے سلوک کر سکتے ہیں..... لیکن آج نہیں..... کل بھی نہیں..... پرسوں۔"

"آج اور کل کیوں نہیں؟"

"آج اور کل میں وہ کچھ کام کرنا چاہتے ہیں..... پھر اپنے سامنے تمہاری بوٹیاں نچوائیں گے۔

"پروگرام دلچسپ رہے گا..... لیکن ..... یہ مسٹر رابل یہاں کہاں؟"

"وہ ہمارے مہمان ہیں..... ابھی چند منٹ بعد یہاں آنے والے ہیں..... لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک تحفہ مبارک ہو..... نیلی روشنی کا تحفہ۔"

"نیلی روشنی کا تحفہ!" ان کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی کمرے میں گہری نیلی روشنی پھیل گئی اور انہیں اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہونے لگی۔

(پھر کیا ہوا..... آئندہ شمارے میں پڑھیئے)

بچوں کے مشہور و معروف مصنف
اشتیاق احمد
کے سنسنی خیز،
ہنگامہ آرا،
مزاح اور جاسوسی
سے بھرپور ناول

۵۴۳ — مجرمانہ قدم — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۰ روپے
۵۴۴ — کہانی کے مجرم — " — ۱۰ "
۵۴۵ — خوف کی بستی — " — ۱۰ "
۵۴۶ — ڈرامے کی آگ — " — ۱۰ "
۵۴۷ — چوری کی لڑکی — نئی نسل نیا ادب — ۵۰/۷ "
۲۶ — خفیہ تحریر — انسپکٹر جمشید سیریز — ۱۰ "
۲۷ — نقاب کے پیچھے — " — ۱۰ "
۲۸ — ہوا کے قیدی — " — ۱۰ "
۳۰ — آخری پیکٹ — " — ۱۰ "

۲۰ ستمبر ۱۹۹۳ء
کو آپ کے شہر میں
ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب
ہے
یا
پھر براہِ راست خط لکھ
کر ادارے سے بذریعہ وی پی
منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز
۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں
لاہور، — فون ۳۲۱۵۳۷

فرمانِ خداوندی

محمد سلیم امام، متحدہ عرب امارات

اگر تیرے ماں باپ تیری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی بات گراں لگنے لگے تو انہیں نہ جھڑکنا، ان سے خوب ادب سے بات کرنا اور ان کے سامنے شفقت سے، انکساری سے جُھکے رہنا اور یوں دُعا کرتے رہنا کہ اے ہمارے پروردگار! تو ان پر رحمت کر جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھے پالا (اور صرف ظاہری داری ہی نہیں بلکہ دل سے ان کا احترام کرنا) تمہارا رب تمہارے دل کی بات خوب جانتا ہے۔ اگر تم سعادت مند ہو (اور اگر غلطی سے کوئی بات خلافِ ادب سرزد ہو جائے تو تم توبہ کر لو) تو وہ توبہ کرنے والوں کی خطائیں بڑی کثرت سے معاف کرنے والا ہے۔

(سورہ بنی اسرائیل کا ترجمہ۔)

حمدِ باری تعالیٰ

اعجاز حسین پٹھان، عمرکوٹ

جس نے بنائی دُنیا
جس نے بسائی دُنیا
پھُولوں کو تازگی دی
ہم سب کو زندگی دی
میداں بنائے اس نے
دریا بہائے اس نے
اس نے بنائے انساں
اس نے بنائے حیواں
اس نے ہی دی ہے راحت
اس نے ہی بخشی نعمت
گاتے ہیں گیت اس کے
یہ خوش نما پرندے
سب ہاتھ کو اُٹھا کر
اپنی جبیں جُھکا کر
مانگیں گے اس کے در سے
پائیں گے اس کے در سے
اعجاز حمد خواں ہے
رب میرا مہرباں ہے

ہوگئے پھر ناکام

ارم حبیب

ہمیں کہانیاں اور نام چھپوانے کا بے حد شوق ہے اس کا اندازہ آپ ہر رسالے میں چھپنے والی ہماری "شاہکار" تحریروں سے لگا سکتے ہیں لیکن بد بخت ردی کی ٹوکری پھر بھی ہماری پیچھا نہیں چھوڑتی اور "جہاں ہے جیسی بھی ہے" کی بنیاد پر کوئی ایڈیٹر انہیں نہیں چھاپتا۔ ہماری کہیں کہانیاں مختلف رسالوں کے ایڈیٹران کے "پوسٹ مارٹم" کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ اگر وہ ایڈیٹران کے ظالم رویوں کی بھینٹ نہ چڑھتیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اردو ادب کا لازوال شاہکار ثابت ہوتیں اور قرۃ العین کے بعد ارم حبیب کا نام ضرور آتا۔

ہم اپنی شاہکار کہانیاں ڈوب کر لکھتے ہیں اور کہانی رسالے کے ایڈیٹر کو پوسٹ کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ برائے مہربانی اس میں کوئی کمی و بیشی یا کانٹ چھانٹ نہ کی جائے ورنہ اصل کہانی ڈوب جائے گی۔ جواب میں ایڈیٹر صاحب کا خط بمعہ کہانی واپس آجاتا ہے کہ اگر ہم نے آپ کی کہانی جوں کی توں چھاپ دی تو ہمارا رسالہ ڈوب جائے گا۔

خیر! ناکام ہونا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں ہے چناں چہ اپنی کئی "شاہکار" کہانیوں کے "پوسٹ مارٹم" کے بعد جب ستمبر کا مہینہ قریب آنے لگا تو

ہم نے کہانیوں کی جگہ مضامین لکھنے کی ٹھانی اور سوچا کہ اپنے پہلے مضمون کا آغاز "یومِ دفاع" سے کرنا چاہئے چنانچہ جھٹ سے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گئے۔

ہم نے لکھنا شروع کیا:

اندھیری رات تھی۔ پاکستانی قوم اور فوج خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی ..... "ہیں! یہ کیا؟ قوم تو سو سکتی ہے مگر فوج نہیں سو سکتی اگر فوج سو گئی تو پھر دفاع کون کرے گا" ..... اس لئے کہ ۱۹۷۱ء میں فوج کو سُلا دیا گیا تھا تو ..... ہمیں تاریخ کی عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

چنانچہ جملہ کاٹا اور دوبارہ اس طرح لکھا۔

اندھیری رات تھی۔ پاکستان قوم خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی کہ بُزدل بھیڑیئے ..... ابھی ہم یہیں تک پہنچے تھے کہ ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ کوئی بُزدل بھیڑیئے کی طرح ہم سے آٹکرایا تھا اور ہمارے پیروں پر چڑھ کر رُک گیا تھا "سُنئے محترمہ! آپ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ خدارا اب تو ہمارے پیر چھوڑ دیجئے" ہم نے اپنی دوست سے کہا جو خوفزدہ شکل بنائے ہمارے پاؤں پر کھڑی ہماری صورت تک رہی تھیں .....

"وہ ..... وہ چھپکلی ..... کک ..... گگ ..... کمرے کے باہر!! ہم نے انہیں آرام سے کُرسی پر بٹھایا اور کہا۔ "آپ بے فکر ہو کر اس کُرسی پر بیٹھئے چھپکلی کمرے میں نہیں آئے گی کیوں کہ آپ آگئی ہیں۔"

اصل میں ہماری یہ دوست "درد سر چیز" ہیں اور وہ آئی بھی اس وقت تھیں جب ہم مضمون لکھنے کی درد سری میں مصروف تھے۔

جب ان کے حواس کچھ بحال ہوئے تو ہمارے قریب آئیں اور چہک کر بولیں "بہت خوب! مضمون لکھا جا رہا ہے" پھر انہوں نے ہمارا لکھا ہوا جملہ پڑھا اور حیرت سے کہا "یہ بُزدل بھیڑیا کون ہے؟"

"بھارت! ہم نے مختصر سا جواب دیا۔"

"بھارت کون؟" انہوں نے پوچھا۔

"آپ کا پڑوسی ملک۔"

"ہمارا پڑوسی ملک کون؟"

"وہی جس کی فلمیں آپ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتی ہیں۔"

"اچھا! انڈیا۔ بھئی انڈیا کہو ناں!!"

پھر وہ مزید گویا ہوئیں۔ "انڈیا کی فلمیں بڑی اچھی ہوتی ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ ہمارا دشمن ملک ہے۔ جس دن سے پاکستان بنا ہے اس نے ہمیں تسلیم نہیں کیا ہے اور اپنی بے ہودہ رسم و رواج والی فلمیں دکھا کر سب کو بگاڑ رہا ہے"۔

"بھئی! اصل میں مجھے تاریخ سے بالکل دلچسپی نہیں۔" انہوں نے کندھے اُچکا کر کہا تو ہمیں بے حد غصہ آیا۔ "آپ کو معلوم ہے جو لوگ اپنی تاریخ بھلا دیتے ہیں ان کا کیا حشر ہوتا ہے؟"

"کیا حشر ہوتا ہے؟" اتنا کہتے ہوئے انہوں

نے جیسے ہی دونوں ہاتھ ہوائی جہاز کے پر کی طرح کھولے ان کا ایک ہاتھ روشنائی کی دوات پر پڑا اور سیاہی اُلٹ کر ان اوراق پر پڑی جن پر ہم نے مضمون لکھنا تھا۔

سارے صفحات کالے ہو گئے۔ سیاہی کے کچھ چھینٹے ہمارے کپڑوں پر بھی گرے۔ ہم مضمون لکھنے میں ناکام ہو گئے تھے اور ہماری دوست اپنے سیاہی سے لتھڑے ہاتھ کو حیرت سے اس طرح تک رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہو "اچھا! تاریخ بھلا دینے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔

آؤ چاند ستارو!

مرسلہ ...... سمیع اللہ، فیصل آباد۔

آؤ چاند ستارو، ایک سبق سیکھو
مِل کر کھیلو کودو، مِل کر پڑھو لکھو
پاکستان ہمارا وطن ہے، ہم اس کے چاند ستارے
قدم بڑھاتے چلو، مل کر آگے بڑھو
ایک ہیں سب کی خوشیاں ایک ہی سب کے دُکھیارے
پیار و محبّت آپس میں بڑھاتے چلو
پاکستان تم سے ہے، تم ہو پاکستان سے
اس کی آن بان بڑھاتے چلو
آؤ چاند ستارو ایک سبق سیکھو
مِل کر کھیلو کودو، مِل کر پڑھو لکھو

ہمارا وطن وہ نہیں جو وراثت میں ہمیں ملا ہو بلکہ پاکستان کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ہڈیاں اینٹوں کی جگہ اور پانی کی جگہ خون استعمال ہوا ہے۔

پاکستان کی وادیاں اپنے اندر فردوس کی رعنائیاں لئے ہوئے ہیں، ہرے بھرے وسیع و عریض کھیت سونا اُگل رہے ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وطنِ عزیز میں ہمیں ہر طرح کی آزادی اور آرام و آسائش میسّر ہے مگر یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ اس میں سلطان ٹیپو رحمتہ اللہ علیہ کا خون، سر سید رحمتہ اللہ علیہ کی نگاہِ دوربین، علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے افکار، قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کی جہدِ مسلسل اور دوسرے اکابرین کے ایثار بھی شامل ہیں۔

قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ "ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنی ہی خالص، پاکیزہ اور مضبوط قوم بن کر ابھریں گے جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔"

ہمیں اپنے وطنِ عزیز سے دلی محبت ہے۔ اس کے بزرگوں سے پیار ہے اور اس کے شہیدوں کے لئے مغفرت کی دُعائیں ہیں جنہوں نے پاکستان کی

عمل کا دن

رفعت ناصر خان، کراچی

خاطر جان، مال گھر بار اور رشتوں ناطوں کی قربانیاں دیں، طوق سلاسل کی سختیاں برداشت کیں اور جب آزادی کے جذبے سے تمام ہندی مسلمان سر شار ہوئے تو زندان کی دیواریں لرز اُٹھیں، فرنگی استعمار سجدہ ریز ہو گیا اور غلامی کی زنجیریں موئے آتش دیدہ بن گئیں۔ چھ ستمبر کا دن ایک ولولے، ایک جوش، ایک جذبے اور ایک عزم کا نام ہے ایک ایسا عزم جس کے آگے پہاڑ رائی بن جاتے ہیں، سمندر راستہ چھوڑ دیتے ہیں اور آندھیاں رُخ بدل لیتی ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ چھ ستمبر کا یہ دن "رسم" بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ جب کوئی چیز "رسم" بن جاتی ہے تو اس کی روح ختم ہو جاتی ہے، دھڑکنیں خاموش ہو جاتی ہیں اور ولولے ساکت ہو جاتے ہیں۔

قوموں کی زندگی دلِ زندہ سے عبارت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے عمل کی راہیں متعیّن کرنا چاہئے۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، مہاجر اور پٹھان کی فکر چھوڑ کر ایک قوم بننا چاہئے "پاکستانی قوم" جس نے آزادی "اِسلام" کے نام پر حاصل کی ہے۔ آج یہ عہد کیجئے کہ ہم اپنے کسی بھی عمل، حرکت یا کسی بھی بات سے وطنِ عزیز پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔

اِسلام زندہ باد

پاکستان پائندہ باد

شیخ سعدیؒ نے فرمایا!

(۱) بھلائی اور خیر کے کاموں میں عجلت کرنی چاہئے کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

(۲) نیکی کا اجر کبھی نہ کبھی ضرور ملتا ہے۔

(۳) اللہ کے نیک بندے عفو در گزر سے کام لیتے ہیں۔

(۴) انسان دوسروں کی طرف سے مہربانیوں کو بھول جاتا ہے مگر رنج اگر ایک بھی پہنچے تو یاد رکھتا ہے۔

(۵) نیکی اس حد تک نہیں کرنی چاہئے کہ لوگ باگ بھیڑیئے کی طرح تجھ پر اپنے دانت تیز کریں۔

مرسلہ: عبدالمعید فاروقی، کراچی

ایک کوّا جنگل کے اندر اُڑ رہا تھا کہ اس کی نظر مور کے خوبصورت ٹوٹے ہوئے پروں پر پڑی جو زمین پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ زمین پر اُتر کر ان پروں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ "اگر یہ پر میں اپنے جسم پر لگا لوں تو یقیناً میں مور بن جاؤں گا"

کوّا چلا ہنس کی چال

مرسلہ: محمد شعیب خان

کوّے نے سارے پر اکٹھا کئے اور ایک درخت سے نکلنے والی گوند کی مدد سے مور کے پر اپنے جسم پر چپکا لئے۔

اس تمام کام سے فارغ ہونے کے بعد کوّا جنگل کے تمام پرندوں کے درمیان پہنچا اور فخریہ انداز میں گردن اکڑا کر کہنے لگا۔

"مجھے دیکھو، میں جنگل کا حسین ترین پرندہ مور ہوں۔ تم لوگ مجھے اپنا بادشاہ بنا لو۔"

جنگل کے پرندے بہت حیران ہوئے۔ انہوں نے کبھی ایسا پرندہ نہ دیکھا تھا نہ سُنا تھا کہ جس کے پر تو مور جیسے ہوں اور آواز کوّے جیسی۔ وہ کوّے کو چاروں طرف سے گھوم پھر کر دیکھنے لگے۔

کوّا بہت فخر محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ تمام پرندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے جبھی تو اس کے پروں کو تحسین بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی اور کوّا بارش کے پانی میں بھیگ گیا۔ پانی سے اس کے جسم سے لگے مور کے پر نکل گئے۔

پرندوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو کوّا ہے جو مور کے پر لگا کر مور بننے کی کوشش کر رہا تھا تو تمام پرندوں نے اسے مل کر خوب مارا اور اتنا پیٹا کہ کوّا بے چارہ ادھ مرا ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد کوّے نے مور بننے سے توبہ کر لی۔

حیرت ہے !!

○ ..... ہاتھی اور چوہے کے دانت ساری عمر بڑھتے ہیں۔

○ ..... عورتوں کی بنسبت مرد زیادہ کروٹ بدلتے ہیں۔

○ ..... آسٹریلیا میں کوئی گلہری نہیں پائی جاتی۔

مرسلہ: فہیم عزیز، کراچی

بدحواسی

سلمان ستار

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم ساتویں جماعت کے طالب علم تھے۔ کلاس میں مطلوبہ مضمون کے ٹیچر نہ ہوتے اور ان کی عدم موجودگی اور غیر حاضری میں پوری کلاس شور سے آسمان سر پر اُٹھا لیتی تو ہمیں بہت ناگوار گزرتا۔

ہم نے ایک نُسخہ اپنے ذہن میں فِٹ کر رکھا تھا جس پر گاہے بگاہے عمل کرتے رہتے تھے۔ وہ یہ کہ جب کلاس پر مذکورہ کیفیت طاری ہوتی تو ہم بدحواسی میں بھاگتے ہوئے اداکاری اور ایکٹنگ کے ساتھ زور سے دروازہ کھولتے اور مطلوبہ و مذکورہ ٹیچر کا نام لیتے ہوئے ان کی آمد کا اعلان اونچی آواز سے کر دیتے اور کلاس پر جیسے سکوت طاری ہو جاتا۔ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کی مثال صادق آجاتی اور ایسا بہت کم ہوتا کہ غیر حاضر ٹیچر تشریف لاتے کیونکہ وہ چھٹی پر ہوتے یا ضروری کام کی غرض سے کہیں گئے ہوتے۔ بہر حال ہوا یہ کہ ایک دن ماسٹر صاحب کی غیر حاضری میں پوری کلاس نے اودھم مچا رکھا تھا اور ہم غصّے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ آناً فاناً ہمارے دماغ کے کمپیوٹر میں مذکورہ آزمودہ نُسخہ آزمانے کا خیال آیا اور ہم نے ہنگامی حالت میں اس پر عملدرآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم نے بھاگتے ہوئے زور سے دروازہ کھولا اور بدحواسی اور تیز کرخت آواز میں ماسٹر صاحب کی آمد کا اعلان کر دیا لیکن غلطی سے ہم اپنی کلاس ہفتم "ب" کی بجائے "الف" کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں ایک سخت گیر اور غُصیلے ماسٹر صاحب اپنی کلاس کو لیکچر دے رہے تھے اور پوری کلاس خاموشی اور سکون سے ہمہ تن گوش تھی۔ ہمارا دِماغ تو چکرا کر رہ گیا اور ہماری حالت یہ کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ پوری کلاس کو ہم ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے اور ماسٹر صاحب حیرت اور استعجاب سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جبکہ ہماری کلاس کے لڑکے ہماری حرکات و سکنات سے محظوظ ہو کر اپنے اُبلتے ہوئے قہقہوں کو روکتے ہوئے خوشی اور مسرّت چہروں پر سجائے ہمیں دیکھ رہے تھے

جیسے ہمارے سر پر سینگ اُگ آئے ہوں یا ہم دُنیا کا آٹھواں عجوبہ ہوں۔

ان ماسٹر صاحب نے کتاب کو کرسی پر رکھا اور ہمیں کان سے پکڑ کر دریافت کیا کہ سکوت بھری کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے دخل اندازی کے مرتکب کیوں ہوئے ہو؟ ہم نے اپنی صفائی بیان کی کہ ہمارا مطلق ارادہ آپ کے ہاں دخل اندازی نہیں تھا۔ اپنی کلاس کو ماسٹر صاحب کی آمد سے آگاہ کرنے آئے تھے کہ آپ کے ہاں داخل ہو گئے۔ ماسٹر صاحب نے بس جلی کٹی سنانے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ تو خیریت گزری کہ انہوں نے مولا بخش کا بے دریغ استعمال نہ کیا ورنہ لڑکوں کے سامنے ہماری جو دُرگت بنتی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ اب کبھی جب مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اپنی بدحواسی پر ہنسی آجاتی ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں

(مرسلہ: عظمت نواز، اٹک)

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کس صحابیؓ کو تین بار جنّتی ہونے کی بشارت دی تھی؟

۲۔ اسلام کے شروع میں دو نمازیں پڑھی جاتی تھیں، نام بتایئے؟

۳۔ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب کون سی ہے؟

۴۔ کون سے پیغمبرؑ کا ذکر قرآن پاک میں سب سے زیادہ آیا ہے؟

۵۔ ساتویں آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کل کتنے انبیا سے ہوئی؟

۶۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلامی پرچم کا کون سا رنگ تھا؟

۷۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ کس نے پڑھائی؟

۸۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کہاں دفن ہیں؟

۹۔ کس مسجد میں نماز پڑھتے وقت قبلہ بدلنے کا حکم ہوا؟

....

جوابات...... (۱) حضرت عثمانؓ۔ (۲) نمازِ فجر اور نمازِ مغرب۔ (۳) قرآن پاک۔ (۴) حضرت موسیٰؑ۔ (۵) ۸ انبیا سے۔ (۶) سفید رنگ۔ (۷) حضرت امام حسینؓ (۸) بیت المقدس۔ (۹) مسجد بنو سلمہ

چھ ستمبر کا دن کا غیر معمولی اہمیت حامل ہے۔ یہ دن قومی یکجہتی، ملی اتحاد اور باہمی یگانگت کی طرف بلاتا ہے اور انفرادی و اجتماعی سطح پر ہمیں متحد رہنے کا درس دیتا ہے۔ پاکستان کی قومی تاریخ میں ۶ ستمبر کا دن افراد کے دلوں میں اجتماعی بہبود اور امن و سلامتی کے شعور کی بیداری کا دن ہے۔ اس دن نہ چور بازاری ہوئی نہ مہنگائی۔ لوٹ کھسوٹ اور بے ایمانی کی جگہ دیانتداری اور صداقت کی حکمرانی نظر آئی۔ لوگ ڈر خوف سے بے نیاز اپنے روز مرہ کے معمولات میں مصروف رہے اور فوج نے رات کی تاریکی میں چھپ کر حملہ کرنے والی بزدل بھارتی فوج کو شکست دینے کے لئے بھرپور کوششیں شروع کر دیں حلاں کہ دشمن طاقت میں تین گنا تھا لیکن پاکستانی فوج ایمان کے جذبے سے لڑی اور دشمن کو صرف سترہ دن میں عبرتناک سبق دیا۔ اقبالؒ نے اسی موقع کے لئے شائد یہ شعر کہا ہے

کافر ہے تو شمشیر پر کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

مسلمان سائنسدان

شہلا صدیقی

ابو ہاشم خالد

"ابو ہاشم خالد کا تعلق خاندان بنو اُمیّہ سے تھا۔ ان کا شمار کیمیا اور طب کے جید عالموں میں ہوتا ہے۔ انہیں فن کیمیا کا بانی بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے انہوں نے ہی اس علم میں مہارت حاصل کی اور کئی کتابیں بھی لکھیں۔ البیرونی نے ابو ہاشم خالد کو مسلمانوں کا پہلا حکیم تسلیم کیا ہے۔ ابو ہاشم جوانی میں ہی انتقال کر گئے لیکن ان کی روشن کی ہوئی شمع سے مسلمان سائنس دان صدیوں تک تحقیق کی راہ پر گامزن رہے۔

الطبری

یہ عظیم مسلمان سائنس دان طبرستان میں ۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے شہر کے حوالے سے "الطبری" کے نام سے شہرت پائی۔ ان کا پورا نام ابو موسیٰ علی بن ابن تھا۔ انہیں طب، فلسفہ طبعیات، علم حیوانات، علم توکید و نفسیات پر مکمل عبور حاصل تھا۔ "کتاب الفہرست" کے مطابق الطبری نے ۶ کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی کتاب "فردوس الحکمۃ" ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں طبعیات کے علاوہ علوم ولفر المواسم، علم حیوانات، فلکیات وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب کے ۳۶۰ ابواب ہیں۔ ان کی اسی کتاب سے مشہور سائنس دان الرازی اور ابن سینا نے بھی استفادہ حاصل کیا۔ الطبری کا انتقال ۸۹۹ء میں ہوا۔

ماں کی نصیحت

محمد عالم۔ جھنگ صدر

وقاص اپنی ماں کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا اس کا باپ وفات پاچکا تھا۔ ماں بیٹا بڑی تنگدستی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک دن وقاص نے اپنی ماں سے اجازت لی تاکہ وہ کوئی کام تلاش کر سکے اور جب وہ جانے لگا تو اس کی ماں نے اسے تین نصیحتیں کیں۔ (۱) اکیلے کبھی سفر نہ کرنا (۲) چارپائی کو ہمیشہ جھاڑ کر اس پر بیٹھنا (۳) ہمیشہ غصے سے بات پوچھنا۔ وقاص اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ وہ اکیلا جارہا تھا راستے میں اسے ایک کچھوا گرمی میں پڑا دکھائی دیا وقاص نے اس کو اپنے گیلے رومال میں باندھ لیا اور آگے چل پڑا اب وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ کچھوا بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب وہ جنگل سے گزر رہا تھا تو آرام کرنے کی غرض سے ایک سایہ دار درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اس درخت پر ایک کوے اور سانپ کا بسیرا تھا۔ وہ آپس میں گہرے دوست تھے۔ جب بھی کوئی مسافر اس درخت کے نیچے لیٹتا تو سانپ اس کو ڈس لیتا اور کوا اس کی آنکھیں نکال لیتا تھا۔ جب وقاص درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا تو کوے نے کائیں کر کے سانپ کو بلا لیا اور سانپ نے وقاص کو ڈس لیا۔ کچھوا یہ سب منظر دیکھ رہا تھا جب کوا وقاص کی آنکھیں نکالنے کے لئے آیا تو کچھوے نے کوے کی ایک ٹانگ پکڑلی اور اپنے جسم کو خول کے اندر چھپالیا۔ کوے نے شور مچانا شروع کر دیا۔

سانپ نے جب کوے کو آواز سنی تو وہ اپنی بل سے باہر آیا اور دیکھا کہ کچھوے نے اس کے دوست کی ٹانگ پکڑ رکھی ہے۔ سانپ نے آگے بڑھ کر کچھوے کو ڈسنا شروع کر دیا۔ مگر کچھوے نے اپنا سر خول میں چھپالیا۔ خول کی وجہ سے اسے کچھ نہ ہوا۔ کچھوے نے کوے سے کہا کہ جب تک سانپ اس شخص کا زہر چوس نہیں لیتا میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ کوے نے سانپ سے کہا تو

سانپ نے زہر چوس لیا اور اس طرح وقاص کو نئی زندگی مل گئی۔ وقاص کو سارے معاملے کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے کچھوے کو ایک دریا میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ دریا کے پاس پہنچ گئے تو کچھوے نے پانی میں ڈبکی لگا کر پانی کی تہہ سے دو قیمتی لعل نکالے اور وقاص کو دے دیئے۔

وقاص لعل لے کہ آگے بڑھا تو اس کا سامنا ایک ٹھگ سے ہو گیا۔ ٹھگ بھانپ چکا تھا کہ وقاص کے پاس قیمتی لعل ہیں۔ وہ وقاص کو اپنے گھر لے گیا اور اس کو کھانا کھلایا اور رات کو سونے کے لئے چارپائی دی۔ جب وقاص چارپائی پر لیٹنے لگا تو اس کو ماں کی نصیحت یاد آگئی اور اس نے چادر کو جھاڑا تو دیکھا کہ اس کے نیچے ایک کنواں تھا اور چارپائی بغیر بان کی تھی۔ وقاص ٹھگ کی چال جان چکا تھا اس نے غصے سے ٹھگ سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو ٹھگ ڈر کر ہاتھ جوڑنے لگا۔ وقاص نے اسے معاف کر دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے لعل بیچ دیئے اور کپڑے کا کاروبار کرنے لگا۔ اس طرح اسے ماں کی نصیحت پر عمل کرنے کی وجہ سے غربت سے نجات مل گئی اور وہ ماں کے ساتھ سکون سے زندگی گزارنے لگا۔ ■

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد

...... محمد حسین آزاد دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی محمد باقر تھا جو مشہور شاعر استاد ذوق کے دوست تھے۔ آپ شاعری اور تعلیم دونوں میں استاد ذوق کے شاگرد تھے۔ بعد میں آپ دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد آپ لکھنؤ آگئے۔ کیونکہ انگریزوں نے آپ کے والد کو گولی سے اڑا دیا تھا اور آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے تھے۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور پہنچے اور پھر وہاں تعلیم کے محکمے میں ملازمت اختیار کر لی۔ اسی دوران آپ نے اُردو اور فارسی کی کئی درسی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۶۵ء میں آپ کابل، بخارا اور ایران گئے۔ آپ نے انجمنِ پنجاب کی سرپرستی میں بہت سے مشاعرے کرائے۔ پھر آپ دوبارہ ایران گے۔ کافی عرصہ تک آپ گورنمنٹ کالج میں عربی اور فارسی کے پروفیسر رہے۔ ۱۸۸۷ء میں آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ آپ کا انتقال ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کو ہوا۔

آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں آبِ حیات، دربارِ اکبری اور سخندانِ پارس سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ آپ اُردو کے بلند پایہ انشاء پرداز ہیں۔

قیصر محمود قیاسی

کام کی بڑائی

قیصر حمید نجم، جھنگ صدر

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بغداد کے ایک نواحی گاؤں میں ایک غریب لکڑہارا رہتا تھا۔ اس کی ایک بیوی اور دو بچے تھے۔ لکڑہارا روزانہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر شہر میں بیچ آتا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ جنگل میں لکڑیاں کاٹتے ہوئے اس کی بیوی بچے بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے اور اس کے کام میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ لکڑہارے کے بیٹے فرمانبردار تھے۔ لکڑہارا ان سے جو کام کہتا وہ جھٹ کرنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ لکڑہارا اپنے بیٹوں کی فرمانبرداری سے بڑا خوش تھا۔ ایک دن وہ اپنے معمول کے مطابق کام کر رہے تھے جس درخت کو لکڑہارا کاٹ رہا تھا، اس پر ایک پرندہ آبیٹھا اور اونچی آواز میں وہ لکڑہارے سے کہنے لگا کہ اگر وہ اس زمین کو جو درخت کے ساتھ ہے کھودے گا تو اس میں اسے اسے بہت سا خزانہ ملے گا۔ لکڑہارا پرندے کی یہ بات سُن کر بڑا حیران ہوا اور وہاں سے زمین کھودنے لگا۔ کچھ دیر زمین کھودنے کے بعد لکڑہارے کو ایک چھوٹا سا صندوقچہ نظر آیا۔ اس نے صندوقچہ کھولا تو اس میں اسے بہت سارے ہیرے جواہرات پڑے نظر آئے۔ لکڑہارا اور اس کی بیوی بچے بڑے خوش ہوئے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور گھر کی طرف چل پڑے۔ انہیں محنت کا صلہ مل چکا تھا۔

لکڑہارا اب بہت امیر ہو گیا تھا لیکن اب بھی وہ محنت کرنا نہیں بھولا تھا۔ لکڑہارے کے پڑوسیوں نے جب دیکھا کہ لکڑہارا اتنا امیر ہو چکا ہے تو وہ لکڑہارے کے پاس آئے اور اس سے دریافت کرنے لگے کہ وہ اتنا امیر کیسے ہو گیا ہے تو لکڑہارے نے تمام روداد انہیں سُنا ڈالی۔ پڑوسی بڑے خوش ہوئے اور اپنے بیٹوں کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف چل پڑے۔ جب وہ جنگل میں پہنچے تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو کچھ لکڑیاں چُننے کو کہا۔ ان کے بیٹوں نے جواب دیا "ہم سے یہ کام نہیں ہوتا۔ ہم نے گھر کا کام کبھی نہیں کیا۔ یہ کیا خاک کریں گے؟۔" ابھی انہوں نے یہ کہا تھا کہ وہ پرندہ درخت کی مُنڈیر پر آبیٹھا اور کہنے لگا کہ "تم یہ خزانہ کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ اور لوگ تھے جو خزانہ لے گئے۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ صلہ وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن کو محنت کرنے کی عادت ہو" یہ کہہ کر پرندہ اُڑ گیا اور وہ سب منہ لٹکائے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

بچوں کا گیت

مرسلہ

فرحانہ عظیم فرح

کراچی

تم جگنو ہو، تم تارے ہو
تم پیارے راج دُلارے ہو
تم عِلم کی دولت اپناؤ
خوشیوں کا پرچم لہراؤ
گیت اپنے وطن کے گاؤ تم
باطل کے نقش مِٹاؤ تم

پینسلین کی ایجاد

کاشفہ خاتون نقوی

اتفاق اور ذہن رسا کی فتح کا شاندار کارنامہ سر الیگزینڈر فلیمنگ کے ہاتھوں سینٹ میری کے ہسپتال میں انجام پایا اور پینسلین ایجاد ہوئی۔ جسے دنیا کی عجیب الاثر دوا سمجھا جاتا ہے۔ سر الیگزانڈر پہلی عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی میڈیکل کور کا رکن تھا۔ اسے یہ دیکھ کر حد درجہ قلق ہوتا کہ اگرچہ زخمیوں کے لئے بروقت اعلیٰ درجے کی طبی امداد کا انتظام کر دیا جاتا تھا پھر بھی خون میں زہریلے جراثیم پھیل جانے سے بے شمار موتیں واقع ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ باقی زندگی ان جراثیم کی تحقیقات میں گزار دے گا جو زخمیوں کی موت کا باعث ہوتے ہیں۔

ایک روز وہ اپنی تجربہ گاہ میں کام کر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ پیپ پیدا کرنے والے جراثیم پھپھوندی

کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس نے خوردبین سے دیکھا تو جراثیم مر رہے تھے پھر اس نے پھپھوندی کے اثرات کا خوب تجربہ کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انسانی جسم میں زہر پیدا کرنے والے جراثیم کی اکثر قسمیں اسی سے ہلاک ہو جاتی ہیں۔ اور یہ انسانی جسم پر کوئی مضر اثر بھی نہیں ڈالتی۔ اس دریافت سے طبی دنیا میں انقلاب آ گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو آکسفورڈ میں سائنس دانوں کی ایک جماعت نے سر الیگزانڈر فلیمنگ کی دریافت کے متعلق باقاعدہ تجربات کئے۔ ۱۹۴۱ء میں تجربات کامیابی کی آخری منزل پہنچ گئے۔ پھر امریکہ کے تعاون سے وسیع پیمانے پر پینسلین کی تیاری شروع ہو گئی۔ اور جنگ میں بے شمار جانیں اس کی بدولت بچ گئیں۔

آج کل تمام ڈاکٹر اس سے وسیع پیمانے پر کام لے رہے ہیں۔ یہ جسموں کو زہریلے اثرات سے محفوظ رکھنے میں بھی موثر ہے۔ پینسلین سے اور بہت سی چیزیں تیار کر لی گئیں ہیں۔

کشمیر ہمارا ہے

ہر خواب کو خوشیوں کی تعبیر ملے گی اب
آزاد فضاؤں کی تنویر ملے گی اب
سن لے یہ جہاں سارا، اپنا یہی نعرہ ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

مظلوم نے ظالم سے نہ ظلم سہا دائم
دستورِ جہاں ہے یہ، ظالم نہ رہا دائم
ہمت کے سفینے کو، امید کنارا ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

کشمیر کے ماتھے پر تحریر ہے "پاکستان"
آکاش پہ لکھا ہے "کشمیر ہے پاکستان"
برفیلی چٹانوں پر وہ "چاند ستارہ" ہے
کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے

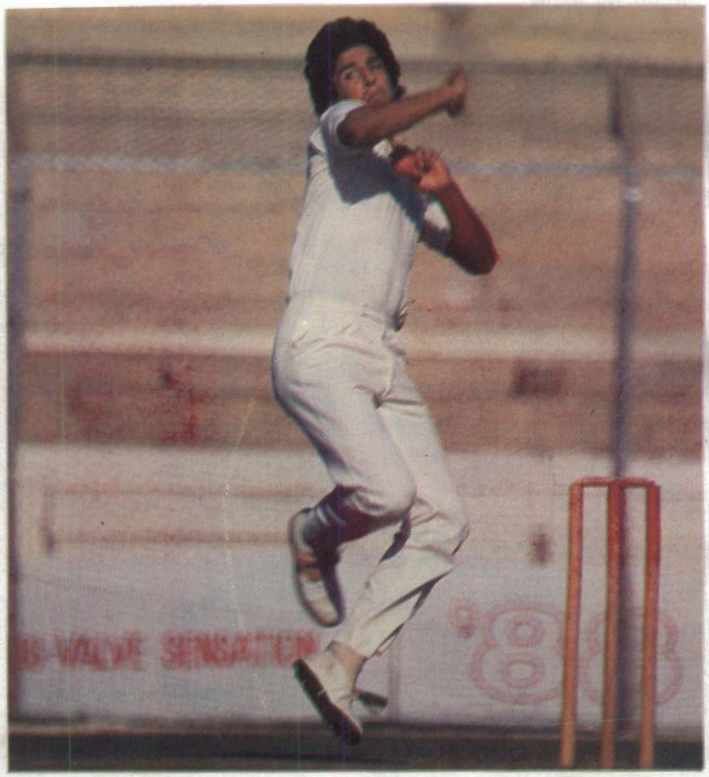

مہارت کی بلندی۔ پی آئی اے کی جستجو
اَب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں۔ جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

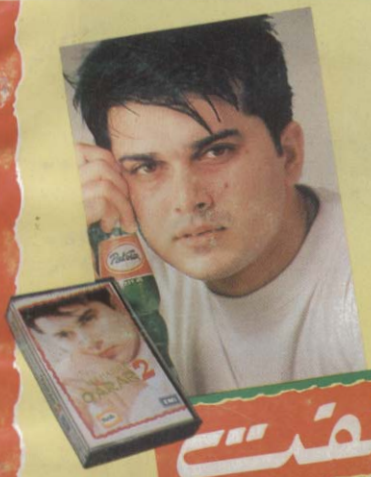

REGD. No. M-266 SEPTEMBER 199
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI

سکول و کالج کی کتابوں کا مرکز